عصمت چغتائی

آدھی عورت آدھا خواب



آدھی عورت آدھا خواب

عصمت چغتائی

مکتبہ شعروادب، سمن آباد، لاہور

ناشر .... نواز
مطبع .... معظم پرنٹرز لاہور
قیمت .... [illegible]/- روپے

ترتیب

میری آپ بیتی

جب میں اپنی زندگی کا سب سے پہلا منظر یاد کرتی ہوں تو لال لال شیشوں والا ایک گول چمکیلا کمرہ آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔ جہاں میں تالیاں بجاتے ہوئے پھرا کرتی تھی۔ یہ شیش محل میری ماں کا پیٹ تھا، جو اس کمرے کی شکل میں مجھے اب بھی کبھی کبھی دکھائی دیتا ہے۔ پھر ایک اور دروازہ یاد آتا ہے، جس کے اندر زرق برق لباس پہنے میں کھڑی ہوں اور لوگ میرے اردگرد گھوم رہے ہیں۔ بات یوں تھی کہ میں اپنے ماموں کی شادی میں ناچ رہی تھی۔ لوگ کھڑے تھے، جو مجھے گھومتے دکھائی دے رہے تھے۔ آج بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ سب گھوم رہے ہیں، اور میں کھڑی ہوں۔

ہمارے گھر میں ایک سفید گھوڑی تھی۔ میرے سبھی بھائی اس پر باری باری سیر کرتے۔ سائیس انہیں گھما کر لاتا۔ میں للچائی نظروں سے انہیں دیکھتی اور گھوڑی پر چڑھنے کی ضد کرتی۔ لیکن ماں کی اجازت نہ تھی۔ وہ کہتیں: لڑکیاں

گھوڑسواری نہیں کرتیں، گھوڑی پر چڑھی تو ٹانگیں توڑدوں گی، لیکن جب بھی میں اپنے کسی بھائی کو سفید گھوڑی پر اکڑ کر بیٹھتے ہوئے دیکھتی تو مچل اٹھتی۔

ایک بار میں گھوڑی کے پیچھے روتی ہوئی جارہی تھی، بھائی گھوڑی پر شان سے بیٹھا تھا۔ اسی وقت میرے والد کچہری سے لوٹے۔ سائیس سے انہوں نے پوچھا۔

"یہ کیوں رو رہی ہے؟"

اس نے بتایا۔

"گھوڑی پر بیٹھنا چاہتی ہیں۔"

ابا نے کہا "تو بٹھاتے کیوں نہیں؟"

"جی بیگم صاحبہ کی اجازت نہیں ہے۔"

ابا نے کہا "بٹھاؤ۔"

تب سے میں بھی روز سفید گھوڑی پر بیٹھنے لگی۔ گھوڑی پر بیٹھ کر مجھے اپنی فتح مندی کا بے پناہ احساس ہوا۔ باغی عصمت کی یہ پہلی فتح تھی۔ اس کے بعد تو والد جب بھائیوں سے نشانہ لگواتے تو میرے ہاتھ میں بھی کارتوس تھما دیتے، اور نشانہ لگانا سکھاتے۔

بیں دسویں اولاد تھی، میرے پیدا ہوتے ہی بچوں میں ماں کی دلچسپی کم ہوگئی،

مجھے یاد تو آیا دیکھتی یا میری باجی۔ لیکن آیا بھی دو تین سال بعد چلی گئی۔ آیا کا دوسری طرف منہ کئے ہوئے ایک خاص انداز مجھے اب تک یاد ہے۔ جس میں اس کے ہرے ہرے گودنے صاف دکھائی دیتے تھے۔ باجی مجھے بہت سنبھالتی تھیں۔ میں سارا سارا دن ان کی ٹانگوں میں لپٹی اپنے آپ کو محفوظ سمجھتی رہتی۔ اماں تو شاید مجھ سے نفرت ہی کرتی تھیں۔ ہر دو سال کے بعد ان کے بچہ ہو جاتا تھا۔ بھلا ہو اس بندر کا، جس نے ان دنوں فیملی پلاننگ کا کام کیا۔ ہوا یوں کہ اماں پورے دنوں سے تھیں۔ اپنے پیٹ میں کٹوری ٹکائے وہ چنے کھا رہی تھیں، درخت پر بیٹھے ایک موٹے تازے بندر کا دل بھی چنے کھانے کو چاہنے لگا۔ اس نے اوپر سے ماں کے پیٹ پر چھلانگ لگائی۔ اس کے بعد ماں کا حمل ضائع ہو گیا اور اماں کے پھر کبھی بچہ پیدا نہ ہوا۔

میں چار برس کی تھی کہ باجی کی شادی ہو گئی۔ لمبے سے سوکھے سے دولہا جن کی سہرے کی لڑیاں نوچ لینے کو جی چاہ رہا تھا۔ باجی کو لے گئے، وہ تھانیدار تھے۔ گھر بھر میں چھوٹے بڑے سب مجھے چڑھاتے ؎

باجی کے بچھوٹے دا نیدار

باجی کو لے گیا تھانیدار۔

میں بینڈ باجے کے شور میں اپنی رلائی کو گم ہوتے ہوئے دیکھتی رہی۔ باجی چلی گئیں۔ اتنے ہنگامے میں ایک بچی کا رونا بسورنا کتنی اہمیت رکھتا تھا۔ ان دنوں

کبھی کبھی خوابوں میں مجھے اندھیری خالی سڑک پر روتی ہوئی دھیرے دھیرے آگے بڑھتی ایک چھوٹی لڑکی دکھائی دیا کرتی تھی۔ وہ میں ہوتی تھی۔

مجھ میں اور بہنوں میں بڑا فرق تھا۔ وہ سب ایک کونے میں گھیا بن کر اپنے ہونے والے دلہوں کا ذکر کیا کرتی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی بھگا دیتیں۔ بھائی لوگ اپنے کھیل کود میں مست رہتے تھے۔ میں بغیر پارٹی کی تھی۔ یعنی آزاد۔ کوئی بھی مجھے اپنی پارٹی کے دائرے کے قریب نہ پھٹکنے دیتا۔

دھیرے دھیرے میری سمجھ میں آنے لگا۔ کہ بہنوں کی طرح سر جوڑ کر فضول باتیں کرنے سے امرود کے درخت پر چڑھنا زیادہ مزیدار ہے، گھر میں بیٹھ کر باورچی خانے میں نوکروں کے سر پر کھڑے رہنے سے بندر کا تماشا دیکھنا زیادہ دلچسپ ہے۔ اور شادی کے لیے تیار ہونے والے جہیز میں سر کھپانے سے مرغیوں کے پیچھے دوڑنا زیادہ آسان ہے۔ میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ جس پر آج تک چل رہی ہوں۔ گھر میں کس کو اس بات کی فکر تھی کہ میں کیسے بڑی ہو رہی ہوں۔ میں اپنے بھائیوں کے ساتھ وہ سبھی کھیل کھیلتی جو لڑکے کھیلا کرتے تھے۔ گلی ڈنڈا پتنگ بازی اور فٹ بال کھیلتے کھیلتے میں بارہ کی ہو گئی۔ تب تک میں نے پڑھنے کے نام پر قرآن شریف ختم کر لیا تھا۔ شاباشی دینے کی بجائے سب کہنے لگے "اے ہائے اتنی بڑی ہو گئی اور قرآن اب ختم کیا۔ انہیں کی بھانجی کو دیکھئے، پانچ برس کی ہے قرآن بھی ختم کر لیا اور سینا پرونا سب جانتی ہے۔ یہ بھانجی میری بڑی آپا

سی لڑکی تھی۔ آپا بیوہ ہو گئی تھیں، یاد آیا...... ایک بار گھر میں تار آنے سے کہرام مچ گیا تھا۔ پتہ چلا، دولہا بھائی چل بسے۔ میں بہت خوش ہوئی کہ اب باجی واپس آجائیں گی۔ اب پھر راتوں میں اندھیری سڑک پر وہ چھوٹی لڑکی مجھے دکھائی نہ دے گی، لیکن معلوم ہوا یہ بڑی بہن کے شوہر تھے۔ جن کا انتقال ہو گیا، مجھے بڑا غصہ آیا۔ اللہ میاں کو اگر مارنا ہی تھا تو باجی والے دولہے کو مارتے تاکہ میری باجی جاتی لیکن اللہ میاں کو مجھ سے کیا مطلب!۔

بارہ سال کی ہوئی تو ایک دن اماں نے ہاتھ میں پرانے غرارے کی گوٹ نکال کر دی، سوئی دھاگا تھما کر کہا کہ اس کا کمربند سیو، ہاتھ کھل جائیگا جب تک اماں سر پر کھڑی رہتیں، تو دم گھٹتے ہوئے محسوس ہوتا تھا، مرغیاں دوڑاتے یا پیڑوں پر چڑھتے بھائی دکھائی دیتے اور ہاتھ میں سوئی چبھ جاتی۔ اماں کو گھر میں بہت کام ہوتے تھے۔ ان کے جاتے ہی میں ساری گوٹ بند رضائیوں میں گھسا دیتی۔ جب کبھی سردیوں میں بستر کھلتے تو نظر آتی۔

پھر ماں نے کھانا بنانا سکھانا چاہا۔ میں نے کہا۔

"میں تو نہ سیکھوں گی۔"

اماں نے پوچھا "کیوں نہ سیکھو گی۔"

میں نے کہا "شہناز بھائی کیوں نہیں سیکھتے؟"

ماں نے کہا "اس کی بیوی آئے گی وہ کھانا بنائے گی۔"

میں نے کہا" اگر ان کی بیوی مر گئی یا بھاگ گئی تو کون بنائے گا؟"
شہناز بھائی رونے لگے کہ میری بیوی کو کون بھگا رہا ہے؟ تبھی ابا آگئے۔
ساری بات سنکر انہوں نے بڑے پیار سے مجھ سے کہا: "کھانا تو عورتیں بناتی ہیں، سسرال جاکر ان کو کیا کھلاؤگی؟" میں نے جواب دیا:" دولہا غریب ہوا تو کھچڑی بنا کر کھالیں گے۔ اور اگر امیر ہوا تو باورچی بنالے گا۔"
ابا نے اسی وقت سمجھ لیا، اس بھوتنی کا ہم کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔
انہوں نے کہا" کیا کروگی پھر تم؟"
میں نے کہا" سبھی بھائی پڑھتے ہیں، میں بھی پڑھوں گا۔"
تب میرے ماموں مہینہ بھر تک مجھے گھر پڑھاتے رہے۔ اور اس ایک مہینے میں صبح و شام میں نے اتنا پڑھا کہ اسکول میں چوتھی جماعت میں لے لی گئی۔ اس کے بعد ڈبل پروموشن ملا اور میں چھٹی جماعت میں آگئی۔ میں آزاد رہنا چاہتی تھی۔ اور تعلیم کے بغیر عورت کو آزادی نہیں مل سکتی۔ جاہل عورت گھر میں بیٹھ کر میاں سے 'بے وقوف'، جاہل جیسے خطاب پائے گی اور میاں کے دفتر جاتے ہی گھر میں بیٹھ کر پھر اسی کا انتظار شروع کردے گی۔ میں نے سوچا چاہے کچھ ہو جائے۔ کسی سے دب کر نہیں رہوں گی۔ اور جتنا ممکن ہوا پڑھوں گی۔
میں شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ہاں پڑوس کا ایک لڑکا پسند آگیا تھا اس وقت میں بارہ یا تیرہ سال کی تھی۔ محبت تو اس عمر میں خود بخود لڑکی کے دل میں

گھر کرتی لگتی ہے۔ وہ صاحب چھبیس یا ستائیس سال کے رہے ہوں گے۔ ہماری کوٹھی کے پاس ہی رہتے تھے۔ روز سویرے گھوڑ سواری کیلئے جایا کرتے تھے۔ اس وقت میں پابندی سے انہیں دیکھا کرتی تھی۔ انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا کہ یہ چھوٹی سی ننھی منی ان پر دل و جان سے عاشق ہے۔ وہ بہت خوب صورت تھے لیکن میری طرف کیوں دیکھتے! ان کی نظر اپنی عمر کی کسی چھوکری پر رہی ہوگی۔ ہم انہیں صرف گھوڑے پر آتے جاتے دیکھتے ہی رہ گئے۔ پھر تیس سال بعد بمبئی میں وہ شاہد لطیف کی ایک فلم کے سیٹ پر آئے۔ مجھے پہچانتے ہی گلے لگا لیا۔ میں نے دل میں سوچا، ارے کم بخت اب کیا فائدہ؟ تیس سال پہلے گلے لگایا ہوتا تو اپنی دنیا میں کیا نہ ہو گیا ہوتا؟ تب تو ہمارا نوٹس نہ لیا۔ ہم کتنے دن تک اپنی بارہ تیرہ برس کی ننھی جان محبت کی پھواروں سے بھر کر تم پر چھڑکتے رہے! اور اس وقت کے خوبصورت شہزادے کا خواب آج بھی مجھے رومانی کر جاتا ہے۔

کمبخت نے میرا بچپن ہی سکھا دیا۔

طالب علمی کے دنوں میں کئی لڑکے اچھے لگے۔ لیکن تھوڑے تھوڑے دن ہی اچھے لگتے۔ جو بہت خوب صورت اور لائق لڑکے تھے۔ ان پر تو لڑکیاں ہی مرتی تھیں۔ جو سوکھے مریل کترے سے لڑکے تھے وہی لڑکیوں کے پیچھے بھاگتے تھے۔ ایک عیسائی لڑکا بہت ہی خوبصورت تھا۔ اس پر بہت لڑکیاں فدا تھیں۔ ہمارے ساتھ بھی اس کی دوستی تھی۔ لڑکیاں اس کے گھر جا کر کیک پیسٹری بھی کھا آتی تھیں،

ہمارے کالج میں تو صرف لڑکیاں ہی پڑھتی تھیں۔ جب کبھی کوئی لیڈر آتا — جیسے مولانا آزاد ہوئے، نہرو جی آئے، وجے لکشمی پنڈت آئیں۔ ان کی تقریریں یونیورسٹی میں ہوتی تھیں۔ اس وقت ہم لڑکوں کی یونیورسٹی میں جاتے تھے۔ ہال میں لڑکے شریفوں کی طرح بنچوں پر بیٹھے رہتے۔ باہر سڑک پر آتے ہی آوارہ ہو جاتے، سامنے کی پٹری پر چلتے چلتے گھٹیا قسم کا شعر اچھالتے، بلا وجہ ہنستے، یا ایک دوسرے پر گرتے پڑتے چلنا شروع کر دیتے۔ لڑکیاں نیچی نظر کئے اپنی پٹری کی طرف دیکھتے دیکھتے مشکل سے ہوسٹل پہنچتیں۔ اس ڈرامے میں مجھے بڑی کوفت ہوتی...... استانیاں تو سمجھتی تھیں کہ ادھر لڑکیوں نے لڑکوں سے بات شروع کی، ادھر لڑکے ریشہ خطمی ہوئے میں لڑکیوں سے کہتی، یہ لڑکے ہم سے دوستی کرنا چاہتے ہیں، کھا تو نہیں جائیں گے، کیوں نہ ہم ان سے دوستی کر لیں۔ لیکن کوئی لڑکی میری بات سے متفق نہ ہوتی۔

بہر حال جب ہم تقریر سن کر ایک دن اپنی اپنی پٹریوں پر چل رہے تھے، ایک لڑکے نے بلند آواز میں شعر پڑھا تو میں نے اپنی پٹری سے جملہ اچھالا:

"کیوں بھئی۔ کیا یہ جگر کا شعر ہے۔؟"

لڑکے نے دائیں بائیں دیکھا کہ یہ آواز کہاں سے آئی ہے؟ آواز تو زنانہ لگتی ہے۔

میں نے اپنا سوال پھر دہرایا۔ وہ ہکلاتا ہوا بولا۔ "معلوم نہیں۔"

میں نے پھر کہا۔ "خواہ مخواہ اندھیرے میں گوٹی پھینک رہے ہو؟ ارے بھئی، یہ

داغ کا شعر ہے۔" اس کے بعد میں نے لڑکیوں سے کہا،" دیکھو مجھے کسی نے کھایا نہیں، میں تو صحیح سلامت ہوں!"

اس کے بعد کبھی لڑکوں سے ہماری نوک جھونک ہوتی نہیں ہوئی۔ پڑھنے لکھنے کی، شاعری کی باتیں ہوتیں۔ ہاں، تین چار لڑکیاں مل کر لڑکوں سے چائے والے بھی پی لیتیں۔ پہلے سے ہی سوچ کر جاتے، کیا منگوائیں گے؟ سوڈا، سموسے، آلو کی ٹکیوں کا دور چلتا۔ لڑکوں کے گھروں سے جو آموں کے ٹوکرے آتے، مٹھائیاں آتیں، ان میں ہمارے لیے بھی حصہ ہوتا۔ استانیاں خفا ہوتیں تو ایک آدھ آم انہیں بھی دے دیا جاتا۔

ایک بار چھٹیوں میں ہم گھر جا رہے تھے۔ لڑکے بھی ظاہر ہے اسی ٹرین میں تھے جب کسی اسٹیشن پر گاڑی رکتی تو تمام لڑکے ہمارے ڈبے کے سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے۔ ڈر کے مارے لڑکیاں چھولے بھٹورے اور ٹکیوں کی طرف دیکھتی رہ جاتیں نیچے جا کر کسی کو خریدنے کی ہمت نہ ہوتی۔ پیاس کے مارے برا حال تھا۔ میں نے سوچا، یہ سفر تو بڑا بدمزا رہے گا۔ اگلی دفعہ جب پلیٹ فارم پر گاڑی کھڑی ہوئی تو میں نے ایک لڑکے سے کہا:

"ذرا ادھر آؤ۔"

وہ کچھ سمجھا نہیں۔ میں نے دوبارہ اشارے سے بلایا۔ وہ ڈرتے ڈرتے کھڑکی کے پاس آیا۔

میں نے کہا "سوڈا لادو گے" بولا "ضرور" اور پلک جھپکتے ہی سوڈے کی بوتل لاکر میرے ہاتھ پر رکھ دی۔ پیسے لینے سے انکار کرنے لگا۔

میں نے کہا "بھئی دو آنے کیلئے تمہارا احسان کیوں لوں۔ تم نے سوڈا لا دیا، یہ کیا کم ہے؟"

جب گاڑی چلی تو ایک ٹیچر مجھ پر بہت غصہ ہوئی کہ کیوں لڑکوں سے سوڈا منگوایا؟ میں نے کہا "اب کے آیا تو کھانا ہی منگوالوں گی۔ بات ہی تو کی ہے .... بات کرنے میں کیا حرج ہے؟ اگلے اسٹیشن پر ایک سوڈا آپ کو بھی منگوا دیں گے" ٹیچر شاید مائنڈ کر گئیں۔ اگلے اسٹیشن پر لڑکے پھر آئے۔ جب جب پلیٹ فارم آتا، ہم کچھ نہ کچھ منگوا ہی لیتے۔ کافی بے تکلفی ہو گئی۔ سفر بھی خوب مزے میں کٹا۔

بچپن میں مجھے سوتے میں چلنے کی عادت تھی۔ دس برس کی عمر تک یہ عادت رہی۔ سوتے میں اٹھ کر کہیں بھی نکل جاتی۔ ایک بار کنڈی کھول کر باغ میں نکل گئی۔ جب ہوش آیا تو ایک پیڑ کے نیچے کھڑی تھی۔ اسے ہم بھوتوں کا پیڑ کہتے تھے۔ مجھے تو کوئی بھوت ووت نہیں دکھائی دیا۔ لیکن ماں نے سمجھا مجھ پر کوئی بلا ہے۔ انہوں نے درگاہ میں چڑھاوے چڑھائے۔ درگاہ کا ڈنڈا بھوت بھگانے کیلئے میرے سر پر لگائیں۔ لیکن نہ بلا آئی نہ گئی۔ بلا کیا کھا کر بھلا میرا مقابلہ کرتی۔

جب میں نویں درجے میں تھی تو میری شادی کے پیغام آنے شروع ہو گئے تھے۔ ایک لڑکا ڈپٹی کلکٹر تھا۔ ماں نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ اپنی بھونتی لڑکی میں اسی کو دوں گی۔ درزی۔

سنار بٹھا دیئے گئے۔ ایک دن اسکول سے لوٹ کر میں نے چہل پہل دیکھی تو کچھ شبہ سا ہوا۔ اب کوئی اور بہن کنواری تو نہ تھی، پھر یہ ہنگامہ کیسا! سراغ لگانے سے پتہ چلا کہ یہ ہماری ہی شادی کی تیاریاں ہیں، میں تو گھبرا گئی۔ باری باری اماں ابا سے کہا:۔

"میں شادی نہیں کروں گی، پڑھوں گی۔"

ماں بولیں:۔ "پاگل ہے۔" ابا سمجھانے لگے۔ "پڑھنے کو کون منع کرتا ہے! سسرال میں جا کر پڑھ لینا۔" میں نے سوچا، سسرال میں پڑھائی ہو چکی! ابا جیسا کلکٹر ہوا تو ہر سال بچے پیدا کروں گی یا امتحان دوں گی؟

بہت سوچنے کے بعد ایک ترکیب سوجھی۔ میرے ماموں زاد بھائی ممبئی میں ڈاکٹری پڑھ رہے تھے۔ میں نے بہت منت کرتے ہوئے گڑگڑا کر انہیں خط لکھا۔ "مجھے اس عذاب سے نجات آپ ہی دلا سکتے ہیں، آپ کو کچھ نہیں کرنا ہے، صرف ماموں جان کو خط لکھ دیجیے کہ میں آپ کو پسند ہوں۔ آپ مجھ سے شادی کریں گے۔ اس سے میری شادی رک جائے گی۔ اور میں قرآن شریف کی، اللہ پاک کی اور اپنی پڑھائی کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ کبھی آپ سے شادی نہیں کروں گی۔ خدا کیلئے یہ ثواب کا کام کیجیے، میری شادی رکوا دیجیے!"

بھائی میری چال میں پھنس گئے۔ چار پانچ دن بعد جب اماں سفیدی والوں سے مول بھاؤ کر رہی تھیں، ماموں جان بڑبڑاتے ہوئے آئے اور بولے:۔

"شوکت اسے پسند کرتا ہے، لڑکی تم باہر نہیں دے سکتیں، یہ خط دیکھو!"

اماں کی تو باچھیں کھل گئیں۔ ادھ سِلے کپڑے اور پگھلے ہوئے سونے پر سے اٹھ کر درزی اور سنار چلے گئے۔ اپنی شادی رک گئی۔

جب میں چھوٹی تھی تو ہم پردے والی کھٹارا گاڑی میں سکول جاتے تھے۔ وہ دروازے پر آ کر لگ جاتی تھیں۔ اس میں ایک عورت رہتی تھی، وہ باہر جھانکنے پر ڈانٹتی تھی۔ میٹرک تک تو علیگڑھ میں رہے۔ اس کے بعد لکھنؤ ہاسٹل میں چلے گئے۔

بچپن میں باہر اماں کے ساتھ شکرم میں جاتے۔ ان دنوں پردے والی گاڑیاں ہوتی تھیں۔ اسکول ہی میں جب ذرا بڑے ہو گئے، تب گھر والوں نے برقعہ پہننے کے لیے کہا تھا۔ ہاں، یاد آیا۔ ایک بار ہم سب ریل گاڑی میں جا رہے تھے۔ منزل آنے سے پہلے بیبیوں نے اپنے اپنے برقعے سنبھال لیے۔ میں نے سوچا، اترتے ہی مجھے برقعہ پہننا پڑے گا۔ جب نوکر بستر باندھنے لگے، تو میں نے اس میں اپنا برقعہ چھپا دیا۔ سات آٹھ بستر والی پوٹلیوں سے ایک میں وہ بندھ گیا۔ جب ٹرین رکی تو میں نے بہت بھولی بن کر اپنا برقعہ ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ سب نے پوچھا کہ آخر گیا کہاں؟ اماں نے طلب کیا۔ کہیں چلتی ٹرین سے پھینک تو نہیں دیا کم بخت؟ جب پیٹھ پر ایک دو دھول پڑے تو میں نے جیسے بہت سوچ کر جواب دیا۔ "ہو سکتا ہے، بستر میں بندھ گیا ہو، میں نے تکیے کے نیچے رکھ دیا تھا۔"

اب تو کوئی چارہ نہیں تھا۔ بستر بند کرنے میں دو گھنٹے لگے تھے۔ کھولنے میں ایک تو لگتا ہی۔ لہٰذا میں بغیر برقعہ کے ہی باہر نکل آئی۔ ایک بار ابا نے پوچھا: "تم اسکول میں سر

ڈھک کر رکھتی ہو؟"

میں نے کہا "نہیں ڈھکے ہوئے سر میں میں بڑی بیوقوف لگتی ہوں" ابا "ہوں" کر کے رہ گئے

میرا پردہ تو چھوٹ ہی چکا تھا۔ کبھی بہت ضرورت ہوتی، تو کسی بوڑھی سے برقعہ مانگ کر پہن لیتی تھی۔ لیکن ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد جب ابا جودھپور آئے تو سبھی کو برقعہ چھوڑنا پڑا۔ ہوا یوں کہ جودھپور میں ہندو عورتیں چادر اوڑھتی تھیں اور مسلمان عورتیں برقعہ میں ہوتی تھیں، چوپالوں میں بیٹھے مسٹنڈے دیکھتے رہتے کہ اچھا یہ جا رہی ہیں، گھر سے نکل کر کہاں جاتی ہیں؟ یہ پوری خبر رکھتے تھے۔ رشتہ داری میں ہنگامہ ہوتا۔ ان باتوں سے بچنے کیلئے یہ ترکیب نکالی گئی کہ ہندو عورتوں کی طرح چادر اوڑھ کر نکلا جائے۔ نہ کوئی پہچانے گا نہ بات کا بتنگڑ بنے گا۔ تمام پہچان برقعے کی ہوتی تھی۔ اسی وقت سے گھر میں سبھی پردہ چھوٹ گیا۔

کالج پہنچنے تک تو میں برقعہ بالکل چھوڑ چکی تھی۔ یونیورسٹی جانا ہوتا تو کبھی مانگے ہوئے برقعے سے کام چلا لیتے تھے۔ پھر کھدر پہننا شروع کر دیا۔ کھدر کا قصہ یوں ہوا کہ گاندھی جی لکھنؤ آئے، ہم کچھ لڑکیاں ان سے ملنے گئیں۔ آٹوگراف مانگا تو بولے تم سب کھدر پہن کر آؤ گی تو آٹوگراف دوں گا۔ شام کو ہم نے کھدر کی دھوتیاں خریدیں دوسرے دن تیس لڑکیاں بدبودار کھردری، کلف لگی کھدر کی دھوتیاں پہنے گاندھی جی کے دربار میں حاضر ہو گئیں۔ گاندھی جی اپنی پوپلی سی ہنسی ہنس کر جیسے کہہ رہے تھے، دیکھو،

تیس لڑکیوں سے آج بدیسی کپڑا چھڑا دیا۔ اس وقت ہم سب کو انہوں نے بہت پیار سے بٹھا کر آٹو گراف دیئے۔ کھدر کے چکر میں ہم ایک بار گرفتار ہوتے ہوتے بچے،

اس وقت میں ملازمت کرنے لگی تھی۔ جودھ پور اماں سے ملنے جا رہی تھی۔ دن تو تھرڈ کلاس میں کاٹا رات کو سونے کیلئے فسٹ کلاس میں بکنگ کروالی۔ کھدر کی دھوتی پہنے ہوئے تھی،

جودھ پور سے دو اسٹیشن پہلے پھلیرا سے ہی جودھ پور میں خبر ہو گئی کہ کانگریس کی کوئی بڑی لیڈر آ رہی ہے ان دنوں وہاں کانگریس پر پابندی عائد تھی۔ جودھ پور میں جب میں کھدر کی براق، سفید دھوتی پہنے چشمہ لگائے، بیگ ہلاتی ہوئی فرسٹ کلاس کے ڈبے سے پلیٹ فارم پر اُتری تو استقبال کیلئے پولیس کو کھڑا ہوا پایا۔ اتفاق سے سب انسپکٹر میرے خالو تھے۔ وہ کانگریس لیڈر کی جگہ مجھے دیکھ کر چکرائے اور بولے۔ "ارے یہ تو میری بھانجی ہے۔" گھر تک تو عزت کے ساتھ لے گئے، لیکن گھر میں گھستے ہی شروع ہو گئے۔ "بے شرم، بدتمیز، یہ کیا تماشہ ہے!"

میں نے نادان بنتے ہوئے کہا "کون سا تماشہ؟ میں نے تو خالی کھدر کی ساڑھی پہنی ہے، اور تو کچھ بھی نہیں کیا۔" اب تو میں نوکری بھی کرتی تھی، زیادہ بحث میں کون پڑتا؟

ان دنوں جودھ پور میں ایک ہیڈ مسٹرس کی جگہ خالی تھی۔ میں جودھ پور میں موجود پہلی بی۔ اے، بی ٹی پاس مسلمان لڑکی تھی۔ حق مانگتا ہے بمسلمان کا نعرہ بلند

ہوا اور یہ حق مجھے مل گیا۔ میں اسکول کی ہیڈ مسٹرس ہو گئی۔ اسکول جانے لگی تو میں نے چادر اوڑھ لی۔ ماموں بولے "برقعہ اوڑھ کر جاؤ" میں نے کہا "مذاق کر رہے ہیں اور چادر پھینک دندناتی ہوئی یہ کہہ کر باہر چلی گئی کہ پھر برقعہ پہننے کو کہا تو استعفیٰ دے دوں گی۔" میری ضد سے سبھی واقف تھے۔ کوئی کچھ نہ بولا۔

جب ابا نے میٹرک کے بعد آگے پڑھانے سے انکار کر دیا تھا، تب بھی میں نے انہیں یہ بلیک میل کیا تھا کہ اگر آپ نے مجھے آگے نہیں پڑھایا تو میں مشن میں جا کر عیسائی ہو جاؤں گی۔"

ابا نے پوچھا "وہاں کیسے جاؤ گی؟" میں نے جواب دیا تھا "ریل کی پٹری کے ساتھ چلی جاؤں گی، رستہ مجھے معلوم ہے، وہ لوگ فوراً مجھے عیسائی کر کے اسکول میں داخل کر لیں گے۔" ابا آگے پڑھانے کے لیے راضی ہو گئے تھے۔

میرے ابا نے جب یہ دیکھا کہ میں صرف پڑھنا چاہتی ہوں، شادی کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی، تو انہوں نے آگرہ میں ایک چھوٹا سا گھر میرے نام کر دیا۔ اس وقت تین چار ہزار کا رہا ہوگا۔ میں نے اسے اپنے بھائی کی حفاظت میں دیدیا۔ سوچا گھر بیچ کر ولایت چلی جاؤں گی۔ پھر بہت اچھی نوکری مل جائے گی۔ اس لیے آگرہ بھائی کے گھر گئی۔ ان پر اپنا ارادہ ظاہر کیا اور کہا "ہمارا گھر بکوا دیجیے، میں ولایت جانا چاہتی ہوں۔

بھائی کہنے لگے "کونسا گھر؟ وہ گھوڑی والا گھر؟ وہ تو تمہارے جعلی دستخط کر کے ہم

کپ کا بیچ کر کھا چکے ہیں، جو تھوڑے پیسے بچے تھے ان سے تمہاری بھابی کا زیور بنوا دیا۔"

بھابی بولیں: "اے ہائے، ہمیں بیچ میں مت گھسیٹو، ہمیں کیا معلوم تم روپے کہاں سے لائے۔"

میں بہت خفا ہوئی۔ میں نے کہا: "بھائی جان، آپ پر کیس چل سکتا ہے۔"

"ضرور چل سکتا ہے، ہمیں جیل بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن پیسے تمہیں اس وقت بھی نہ ملیں گے۔"

میں نے ان سے پوچھا: "آپ وکیل ہیں بتائیے کیسے کیس کریں؟"

بولے: "ہم تمہارا کیس لڑ سکتے ہیں، فیس نکالو۔"

یہ سن کر میری بھابی گھبرا گئیں۔ بھابی نے انہیں نظر انداز کرتے ہوئے مجھ سے بڑے پیار سے پوچھا: "ولایت جانے کو کیا بڑا جی چاہ رہا ہے؟"

میں نے کہا: "جی تو چاہ رہا ہے۔"

بولے: "تیرتی ہوئی چلی جاؤ" اور پھر انہوں نے بمبئی سے آگے کا پورا راستہ سمجھانا شروع کر دیا: "یہاں دو دن رُکنا، پھر تیرنا، کچھ دنوں میں ولایت پہنچ جاؤں گی۔" میری بھابی بڑی دلچسپی سے ہم دونوں کی گفتگو سن رہی تھیں، بولیں: "اس کے کپڑوں کا کیا ہوگا؟"

بھائی کہنے لگے: "موم جامے میں سی کر پیٹھ پہ باندھ لے گی اور کیا۔"

بھابی نے دوسرا سوال اٹھایا: "سمندر میں تو بڑی بڑی مچھلیاں ہوں گی، اس کو کھا

نہیں جائیں گی۔"

بھائی بولے: "ایک لمبا بانس ہاتھ میں رکھنا، اس سے مچھلیاں ہٹاتے رہنا۔"

وہیں ہمارے بھتیجے بھی بیٹھے ہوئے یہ باتیں سن رہے تھے۔ وہ تھوڑا ہکلاتے تھے، بولے "فو، فو، فو، فو، ہم بھی جائیں گے۔"

اور ان کے بیچ میں کودتے ہی ہمارا ولایت کا سفر ختم ہو گیا۔

میں نے بچپن میں قدم قدم پر زنجیریں توڑی ہیں، میری مخالف پارٹیاں بڑا واویلا مچائیں، لیکن جیت ہمیشہ میری ہی ہوتی۔

شاہد لطیف سے میں سب سے پہلے علی گڑھ میں ملی تھی۔ وہ اس وقت ایم۔ اے کر رہے تھے۔ میں بی۔ ٹی۔ اس کے بعد دلی میں ایک بار سرسری ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد وہ بمبئی آ گئے اور بمبئے ٹاکیز میں کہانی کار، مکالمہ نگار کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ پونے دو سو تنخواہ پاتے تھے۔ جب میں اسکول انسپکٹریس ہو کر بمبئی آئی اور اپنے بڑے بھائی کے ساتھ رہنے لگی، اس وقت پھر شاہد سے ملاقات ہوئی۔ شاہد نے ہمارے گھر میں آنا جانا شروع کر دیا۔ میں بھی ان کے ساتھ تفریح کو نکل جاتی تھی ہم لوگ ساتھ میں فلمیں دیکھتے، چوپاٹی پر ننگے پاؤں گھومتے، دوسرے ادیب دوستوں سے ملتے۔

جب ایکبار شاہد میری کہانی فروخت کرانے کیلئے بمبئے ٹاکیز لے گئے۔ بھائی کو کسی نے بتا دیا۔ بھائی بہت خفا ہوئے وہ سوچتے تھے، میری بہن ساڑھے تین سو تنخواہ

پاتی ہے، کسی ڈیڑھ ہزار پانے والے کے ساتھ اس کی شادی کروں گا، پونے دو سو تنخواہ پانے والے مکالمہ نگار سے ملنا جلنا میرا انہیں پسند نہ تھا۔ اس واقعہ کے بعد جب میرے آنے جانے پر پابندی کی جانے لگی تو میں نے بھائی کا گھر چھوڑ کر ہاسٹل میں رہنا شروع کر دیا۔ میرے بھائی نے میرے انہی ماموں زاد بھائی کو پٹایا، جنہوں نے میری شادی رکوائی تھی کہ تم ابھی تک کنوارے ہو، عصمت سے پوچھو شاید تم سے شادی کرنے کے لیے ہاں کر دے۔ وہ ایک دن گھر آئے کہنے لگے "چوپاٹی چلو گی؟" میں نے کہا "ضرور چلوں گی" تھوڑا تعجب بھی ہوا، چوپاٹی پر گھومنے پھرنے کے بعد وہ کچھ تذبذب سے بولے "بھائی نے کہا ہے کہ اگر تمہاری مرضی ہے تو مجھ سے شادی کر لو" میں نے کہا "توبہ توبہ! تم نے زندگی میں میرے ساتھ اتنی بھلائی کی ہے، میں تمہارے ساتھ یہ دشمنی کیوں مول لوں؟" پھر میں نے سنجیدگی سے کہا "تمہارے لیے جو بیوی میرے ذہن میں ہے، وہ میں نہیں ہوں۔ ایکدم حسین بھولی بھالی لڑکی ہے وہ۔" اور ہم گھر واپس آ گئے۔ شاہد سے میری صرف دوستی تھی اس سے شادی تو کھیل میں ہو گئی۔ خواجہ احمد عباس نے اپنے گھر کے قریب ایک فلیٹ لے دیا۔ محسن ایک قاضی پکڑ لائے اور شادی ہو گئی۔

میں نے شاہد کو شادی سے پہلے خوب سمجھایا تھا کہ میں گڑبڑ قسم کی لڑکی ہوں، بعد میں پچھتاؤ گے۔ میں نے ساری عمر زنجیریں کاٹی ہیں، اب کسی زنجیر میں جکڑی نہ رہ سکوں گی۔ فرمانبردار، پاکیزہ عورت ہونا مجھ پر سجتا ہی نہیں ہے لیکن شاہد نہ

مانتے، انہوں نے بھی دوستی میں ڈینگ ہانک دی تھی کہ عصمت سے شادی کروں گا اور جب سب اس مذاق پر زور سے ہنس دیئے تو شاہد کا ارادہ اور بھی پختہ ہو گیا۔

شادی سے ایک دن پہلے میں نے آخری بار خبردار کرتے ہوئے کہا تھا "اب بھی وقت ہے، مان جاؤ۔ ہم ساری عمر دوست رہیں گے، ایک دوست کی طرح کہہ رہی ہوں۔" جب وہ نہ مانے تب میں نے من ہی من میں سوچا کبھی بعد میں یاد کرو گے کہ کسی دوست نے اچھا مشورہ دیا تھا جو تم نے نہ مانا۔ شادی کے بعد بھی میں نے ایک بار کہا کہ بھئی زبردستی تھوڑی ہے، نہ نبھے تو طلاق دے دینا۔" شاہد کا خیال تھا، اگر وہ کبھی مجھے طلاق دے دیں گے تو لوگ یہی سمجھیں گے میں ہی انہیں چھوڑ کر بھاگ گئی ہوں۔

اس شادی میں میرے بڑے بھائی شریک نہ ہوئے، انہوں نے مرتے دم تک ہماری شکل نہ دیکھی، ہاں، اماں کو معلوم ہوا تو انہوں نے چھوٹے بھائی کو بمبئی یہ دیکھنے کے لیے بھیجا کہ دیکھ کر آ، کمبخت وہاں کیا کر رہی ہے۔ چھ فٹ تین انچ کے میرے چھوٹے بھائی جب شاہد سے دعا سلام کر چکے تو وہ مجھے ایک طرف لیجا کر بولے: "یہ کیا کر رہی ہو! اتنا بھولا، معصوم شکل کا بچہ ہے، اس سے تم شادی کر دگی؟ دماغ چل گیا ہے کیا؟" میں نے بڑی معصومیت سے کہا کہ "میں کیا کروں، مان ہی نہیں رہا ہے۔ میں نے تو کافی سمجھایا، اب تم کوشش کر کے دیکھو۔"

شاہد نے بہت سکھ دیا۔ انہیں کتابیں خریدنے کی لت تھی۔ اچھی اچھی کتابیں خرید کر لاتے تھے، جو بھی نئی کتاب شائع ہوتی خرید لاتے۔ اب تک میرے پاس سب

انہیں کی خریدی ہوئی کتابیں ہیں، مرد عورت کو پوج کر دیوی بنانے کو تیار ہے۔ وہ اسے محبت دے سکتا ہے، عزت دے سکتا ہے، صرف برابری کا درجہ نہیں دے سکتا۔ آہا، کتنی خوبصورت بات، مرد سمجھتا ہے، ان پڑھ عورت سے کیسی دوستی؛ لیکن دوستی کے لیے پیار کی ضرورت ہوتی ہے، علم کی نہیں شاہد نے مجھے برابری کا درجہ دیا تھا، اس لیے ہم دونوں نے ایک اچھی زندگی گزاری۔

آدھی عورت آدھا خواب

عورت ..... عورت..... عورت ....

بُری، اچھی، بے وفا، باوفا، ایسی ویسی اور خدا معلوم کیسی کیسی۔

ہر ملک اور ہر زمانے میں بڑے بڑے مفکروں نے عورت کے بارے میں کوئی نہ کوئی رائے ضرور قائم کی ہے، کوئی صاحب اس کے حسن پر زور دے رہے ہیں تو کوئی اس کی پارسائی اور نیک سیرتی پر مصر ہیں، ایک صاحب کا خیال ہے کہ "خدا کے بعد عورت کا مرتبہ ہے" تو دوسرے صاحب اسے "شیطان کی خالہ" بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔

ایک صاحب فرماتے ہیں "ایک دھوکے باز مرد سے ایک دھوکے باز عورت زیادہ خطرناک ہوتی ہے" جیسے کوئی یہ کہے کہ ایک کالے مرد سے ایک کالی عورت زیادہ کالی ہوتی ہے، کسقدر شاندار بات کہی ہے کہ بس جھوم اٹھنے کو جی چاہتا ہے، اور اگر میں خود عورت نہ ہوتی اور ان اقوال نے مجھے بوکھلا نہ دیا ہوتا تو کہنے

والے کا منہ چوم لیتی، مصیبت تو یہ ہے کہ ان نامعقول مفولوں نے ستی گم کر رکھی ہے۔

اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ جتنا مردوں نے عورت کو سمجھنے کا دعویٰ کیا ہے اتنا عورتوں نے مردوں کے متعلق کبھی قول اپنی عقل سے نہیں بنایا۔

مردوں نے کہا: "مرد ظالم ہوتا ہے"۔ وہ چپ چاپ ظلم سہنے لگیں۔

مردوں نے کہا: "عورت ڈرپوک ہوتی ہے"۔ وہ چوہا تک سے ڈرنے لگیں۔

پھر فرمایا: "وقت پڑے تو عورت جان پر کھیل جاتی ہے"۔ بس جھپٹ سے جان پر کھیل گئیں۔

ماں کی ممتا کا ساری دنیا ڈھول پیٹتی ہے۔ باپ کی باپتا کا رونا کوئی نہیں روتا۔ عورت کی عزت لٹ سکتی ہے، مرد کی نہیں لٹتی، شاید مرد کی عزت ہی نہیں ہوتی، جو لوٹی کھسوٹی جا سکے۔ عورت کے حرامی حلالی بچہ ہوتا ہے، مرد کے کچھ نہیں ہوتا۔

صدیوں سے عورت کے سر لیسے اوٹ پٹانگ الزام تھوپ کر مفکرین اسے بوکھلانے کی کوشش کرتے آئے ہیں، یا تو وہ اسے آسمان پر چڑھا دیتے ہیں یا کیچڑ میں پٹخ دیتے ہیں۔ مگر برابر کھڑا کرتے ہوئے ان کا دم نکلا جاتا ہے، اسے دیوی اور آسمانی مخلوق بنا دیں گے، مگر دوست اور ساتھی کہتے شرماتے

ہیں۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ احساسِ کمتری ہے یا مغالطہ۔ آخر انہیں عورت کی برابری سے کیوں ڈر لگتا ہے، وہ بھی تو انسان ہوتی ہے۔ اسے برابر بٹھاتے کیوں گھبراہٹ ہوتی ہے۔ کیا مرد ایک گھڑی کے لیے یہ نہیں بھول سکتا کہ برابری کے لازمی معنی کمتری کے نہیں ہیں۔ سب کو معلوم ہے کہ عورت۔ ماں، بیٹی، بیوی اور بہن ہی بن سکتی ہے، باپ، بیٹا، میاں اور بھائی نہیں بن سکتی، پھر کیوں بار بار کہتے ہیں کہ وہ اسی لیے پیدا ہوئی ہے۔ کیا عورت کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ وہ عورت ہے جو مسلسل اسے بتایا جا رہا ہے؟

یا شاید مرد جانتے ہیں کہ ماں اور بیوی بننا لوہے کے چنے چبانا ہے۔ اس لیے عورت کے دماغ میں ٹھوکے جاتے ہیں کہ وہ بنی اسی مصرف کے لیے ہے، اسے اسی پر فخر کرنا چاہیئے کہ یہی مزے کا عہدہ ہے۔ انہیں کوئی سمجھائے کہ کس کم بخت عورت نے کبھی اس سے انکار کیا ہے۔ کون کہہ رہا ہے مردوں سے کہ آؤ صاحب تم بچے جنو اور انہیں دودھ پلاؤ، پھر بھلا بار بار جتانے کی ایسی کیا ضرورت پڑ رہی ہے؟

عورت بیوہ ہو جاتی ہے تو اس کی چوڑیاں توڑ دیتے ہیں، مرد کی گھڑی یا عینک یا حقہ توڑنے کا کبھی کسی کو خیال نہ آیا۔ بیوہ لباس میں بھی تبدیلی کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ رنگا دوپٹہ پہنے یا ہاتھوں میں چوڑیاں ڈال لے تو لوگوں کے

کلیجے پھٹ جائیں، مرد وہی سوٹ بوٹ، اچکن، انگرکھا ڈالے پھرتا ہے۔ کیسی بے رحمی ہے کہ دکھاوے کے لیے بھی سوگ نہیں مناتا۔ حالانکہ عورتوں کو جیسے شوہر کا غم ہوتا ہے، بہت سی عورتوں اور مردوں کو نہیں ہوتا، مگر عورتوں کو ڈھونگ رچانا پڑتا ہے۔

ایک صاحب فرماتے ہیں کہ "عورت کی شان یہی ہے کہ دنیا اس سے ناآشنا ہو۔ شوہر کی محبت اس کا بیش بہا خزانہ ہوتا ہے اور اس کا چھوٹا سا خاندان اس کی دنیا۔"

کیوں صاحب اگر کسی عورت کی شہرت ہوتی ہے تو وہ آپ کے حصے کی شہرت تو نہیں چھینتی۔ اللہ کی دین ہے، اس میں آپ کو کیوں تکلیف محسوس ہوتی ہے؟ کیا چھچھوراپن ہے۔ عورت ہو یا مرد، اگر دنیا میں کچھ کر جائے تو کسی کی شان کو بٹہ کیسے لگ جائے گا۔ مرد کی شہرت سے مرد کی عزت نہیں گھٹتی تو عورت کی شہرت سے کیوں اس کی بڑائی کو گھن لگ جائے گا۔

بیوی جاہل کبڈ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں، میاں بیوی سے کم پڑھا لکھا ہو تو بس اندھیر ہو جائے گا۔ چونکہ کسی بڑے مدبر کے قول پر آنچ آجاتی ہے، ڈاکٹر نائیڈو کو جب "مسز سروجنی نائیڈو کے شوہر" کہا جاتا تھا تو بہت کھسیانے ہو جاتے تھے۔ دنیا میں کروڑوں عورتیں اپنے شوہر کی بیوی بن کر مزے سے رہتی ہیں انہیں احساسِ کمتری نہیں ہوتا۔ مرد کے کان میں پیدا ہوتے ہی پھونک دیا جاتا

ہے کہ وہ برتر ہے، اور اس کی معصومیت دیکھئے کہ وہ واقعی یقین کر لیتا ہے کہ وہ دنیا کی لائق ترین عورت سے بُلند ہے۔ صرف اس لیے کہ وہ مرد ہے۔ پھر جب اسے اپنے سے زیادہ تعلیمیافتہ اور عقلمند عورت ملتی ہے تو وہ اس سے نفرت کرتا ہے، کیونکہ اس وقت وہ خود کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ کیا میرا باورچی صرف اس لیے میڈم کیوری سے برتر ہو سکتا ہے کہ وہ مرد کی نسل سے ہے جسے عام طور سے عورت سے بُلند سمجھا گیا ہے؟ مگر یقین نہ آئے تو اپنے باورچی یا دھوبی سے پوچھ لیجیے، وہ یہی کہے گا، عورت کبھی مرد کی برابری نہیں کر سکتی!

ایک اور صاحب فرماتے ہیں: "اگر عورت کے دل کو چیرا جائے تو اس میں تحمل، صبر و برداشت، پوشیدہ قربانیوں اور نادیدہ خوبیوں کے سوا کچھ نہ ہوگا۔" بھئی حد ہے۔ میں نے ایک مرد ڈاکٹر سے پوچھا تو وہ کہتے ہیں: "سب بکواس ہے، عورت اور مرد کے دل کی ساخت بالکل ایک جیسی ہوتی ہے اور اس میں سے الم غلم چیزیں نہیں نکلتیں۔" لیجیے اور سنیے: "وہی ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں: عورت مرد سے زیادہ وسیع القلب نہیں ہوتی۔ یہ تو طبعیت پر منحصر ہے تعلیم اور تربیت مرد اور عورت پر یکساں اثر کرتی ہے۔

ایک صاحب فرماتے ہیں: "جب بچہ پہلی بار ماں کی چھاتی سے دودھ پیتا ہے تو وہ مسرت کے مارے لال ہو کر کانپنے لگتی ہے۔"

خواتین نے فوراً تاڑ لیا ہوگا کہ فرمانے والے صاحب مرد ہیں، اور انہوں نے جو

کچھ لکھا ہے، سنی سنائی ہے۔ یقیناً انہوں نے خود کبھی کسی بچے کو دودھ نہیں پلایا، اور نہیں جانتے کہ بچہ پہلی بار دودھ پیتا ہے۔ تو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ ماں جو لال پڑ کر کانپی ہوگی وہ قطعی محبت اور راحت کی لرزش نہیں ہوگی۔ کرب سے رنگ بدل گیا ہوگا۔

یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ مرد خواہ مخواہ اُلٹے سیدھے مقولے ٹھونکتے رہتے ہیں، اتنا بھی نہیں سوچتے، اب عورتیں بھی بقول ان کے نری عورتیں نہیں رہیں۔ بہت کچھ معلومات حاصل کرنے لگے ہیں۔ اب اس قسم کے گھسے پٹے جملوں سے جھانسے میں نہیں آئیں گی۔ سیدھی سادی تمیز کی بات کیجیے۔ عورتوں کو عورتوں سے زیادہ سمجھنے کا دعویٰ نہ کیجیے تو اچھا ہے۔ مفت میں پول کھلے گا۔ بڑائی چھوٹائی کے جھگڑوں میں پڑ کر وقت برباد کرنے کی آپ کو فرصت کہاں سے مل گئی۔ جنس اور رنگ اور نسل کا امتیاز بڑی تیزی سے مٹ رہا ہے، دنیا بڑی تیزی سے صنعت و حرفت کے میدان میں بڑھ رہی ہے۔ دن بدن کام کرنے والوں کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ ہر شعبے میں عورتوں کو ہاتھ بٹانا پڑ رہا ہے۔

مغربی عورت ہزاروں قسم کی گھریلو مشینوں کے باوجود روزی کمانے پر مجبور ہے۔ اس لیے خانہ داری کے کاموں میں اور بچے پالنے میں مرد کو برابر مدد کرنی پڑتی ہے۔ اگر بیوی رکابیاں دھوتی ہے تو میاں جھاڑو دیتا ہے۔ بیوی بچھونے لگاتی ہے۔ تو میاں بچے کو دودھ کی بوتل تیار کر کے پلاتا ہے۔ دونوں مل کر ناشتہ اور کھانا

کھانا بناتے ہیں۔ بچوں کو تیار کرتے ہیں، پھر خود کام پر جاتے ہیں، جو عورت کام پر نہیں جاتی، وہ خالی بیٹھ کر گپیں نہیں مارتی، دُھلائی کرتی ہے، استری کرتی ہے اور گھر کا سودا لاتی ہیں، وقت بچ جاتا ہے، اس لیے پارٹ ٹائم کام بھی کرتی ہے۔ اس پر بھی یہ حال ہے کہ مشکل سے پورا پڑتا ہے۔

مگر ہمارے یہاں کے مرد لمبے چوڑے مقولوں کے لٹھ لیے عورتوں کو ہانکے جا رہے ہیں، چاہے کتنی تنگی ترشی ہو، بیوی گھر کی زینت بنی بیٹھی رہے، میاں چرخ ہو جائیں گے مگر ناک سلامت رہے، بیوی نسوانیت کا پٹارہ سنبھالے بیٹھی رہیں، چاہے بچوں کو فیس نہ لانے پر شرمندگی اٹھانی پڑے، بنیا قرض مانگ مانگ کر میاں کا ناطقہ بند کر دے، مگر چونکہ کوئی بڑے میاں کہہ مرے تھے کہ "عورت کی دنیا اس کا گھر ہے" تو بس عورتیں لکیر کی فقیر بنی گھر کا گھروا کرتی رہیں گی۔

سب سے زیادہ اقوال زریں عورت کی پارسائی اور پاکیزگی کے بارے میں ارشاد ہوئے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ: "عورت کو قدرت نے کچھ اس طرح بنایا ہے کہ وہ صرف ایک سے محبت کرتی ہے اور اسی پر قربان ہو جاتی ہے۔"

اور مرد؟

مرد کی خصلت میں تنوع ہے۔ وہ ہر دم نئی عورت کی طرف راغب ہوتا ہے۔"

کیوں حضرت! یہ اطلاع آپ کو کس نے دی؟ عورت کی خصلت بھی آپ کے مطلب کے مطابق ڈھال لی گئی، تاکہ آپ اطمینان سے خصلت کے سر پر الزام تھوپ کر رنڈی بازی کریں، اور بیوی کے پیروں میں اسی کی بیڑیاں ڈال دیں کہ وہ خلافِ قدرت بات کرکے پڑوسی سے دیدے نہ لڑانے لگے، اور اس طرح لطافت نسوانی نہ کھو بیٹھے۔ اور تو اور قدرت کو بھی مرد اس سازش میں گھسیٹ لائے۔ حالانکہ یہ حربہ کبھی کارگر ثابت نہ ہوا۔ عورتوں نے آنکھ لڑانا چاہی تو مردوں کو پتہ بھی نہ چلا، وہ یہی سمجھتے رہے کہ عورتیں نیک اور پارسا ہیں یہی ان کی خصلت ہے۔ پھر کیا ڈر ہے۔ مگر کوئی ان سے پوچھے آپ سے کس نے کہا کہ عورت ایکبار محبت کرتی ہے؟

یہ سب ڈھکوسلے کی باتیں ہیں۔ زمانہ بدل رہا ہے، اور ان مقولوں سے رکے رکنے والا نہیں ہے۔ زندگی کی قدریں اچھے یا برے رخ بدل کر رہیں گی۔ خواہ ہم کتنا ماتم کریں، سر دھنیں، حالات عورت کو گھر میں سکون سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔ ہمیں سوچنا چاہیئے کہ جب مجبوراً ہم اپنی بہن بیٹی، ماں اور بیوی کو مردوں کے دوش بدوش کام کرنے پر بھیجنے کے لیے مجبور ہو جائیں گے تو ہمیں ان کی کس قسم کی تربیت کرنا چاہیئے۔ آیا ہم انہیں ان پرانے اقوال کے مطابق شرم و حیا کو قائم رکھنے کی اور ہر وقت نسوانیت کے احساس میں غرق رہنے کی تلقین کریں۔ یا یہ سمجھائیں کہ جب کام پر جاؤ تو اپنی نسوانیت اور ناز نخرے ساتھ مت لے جاؤ،

وہاں نسوانیت کے بل بوتے پر تمہیں اپنی محنت سے اپنا کام کرو، بہتر ہے کہ تمہارے ساتھ کام کرنے والے یہ محسوس نہ کریں کہ تم عورت ہو۔ بلکہ تمہیں اپنا ساتھی سمجھ کر کام سے کام رکھیں۔ آخر کو وہ مرد ہیں، تم عورت ہو۔ اسے جان جان کر نہ جتاؤ تاکہ تم دونوں کا ذہنی سکون قائم رہے، اور ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے کام کی طرف لگو۔

مغربی ممالک میں عورتیں مردوں کے دوش بدوش کام کرتی ہیں، مگر ضرورت سے زیادہ اپنی نسوانیت کا ڈھول پیٹتی ہیں، گھڑی گھڑی میک اپ کرتی ہیں، بال سنوارتی، اور ڈیٹ یعنی دعوت حاصل کرنے کیلئے وہ تمام ناز و انداز استعمال کرتی ہیں، جو اخباروں اور رسالوں کے ذریعے ان تک پہنچتے ہیں۔ وہاں کے رسالوں میں ہزاروں مصنوعات اور خوشبوئیں صرف مرد کو پھانسنے کے پھندے ظاہر کیے جاتے ہیں۔ وہاں کی عورت کے دل میں بھی یہی بٹھا دیا گیا ہے کہ ان کی زندگی کا صرف ایک مقصد ہے کہ انہیں کوئی چاہے۔ ان سے شادی کر کے بچے بخشے، مگر کتنی لڑکیاں ہیں، جو رسالوں کے بتائے ہوئے نسخے استعمال کر کے زندگی کے ان خوابوں کی تعبیر پا لیتی ہیں۔ زیادہ تر تو ایسی ہوتی ہیں کہ مردوں کو ورغلاتی ہیں اور خود ان کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اور ساری عمر پریوں کے شہزادے کے انتظار میں گذار دیتی ہیں، جس ملک کی عورتیں اتنی پراگندہ خیال اور نامراد ہوں، وہاں کے بچے کیوں نہ ٹیڈی بنیں گے، اور بچیاں کیوں نہ اپنی نسوانیت کا رعب جمائیں گی،

میں نے روس میں عورتوں کو ہر شعبے میں کام کرتے دیکھا کسی کے منہ پر نہ میک اپ تھا۔ اور نہ ہی بال بنے ہوئے تھے۔ زیادہ تر بالکل مردوں کی طرح وردیاں پہنے تھیں کہ پہچاننا مشکل تھا۔ بالکل مرد معلوم ہو رہی تھیں۔ مجھے یہ بات بڑی خراب معلوم ہوئی کہ یہ نسوانیت کا خون ہو رہا ہے۔

میں نے پوچھا تو ہماری ساتھی نے بتایا کہ "ہم نہیں چاہتے کہ یہاں کام کے وقت کوئی نسوانیت یا مردانگی کا مظاہرہ کرے"۔

"کیوں؟ تب تو یہ مشین بن جائیں گی؟"

"تو اور اچھا ہے ۔۔ آپ کیا مشین کو کوئی حقیر سمجھتی ہیں؟ ۔۔ ہاتھوں کی بنائی مشین پتھر سے تراشے ہوئے بت سے کچھ کم مقدس ہے۔ اور اگر وہ پتھر ہماری سنتا ہے۔ تو یہ مشینیں بھی ہماری اَن داتا ہیں۔ ہمیں گائے بیل سے زیادہ پیاری ہیں کیونکہ انہیں ہم نے خود بڑی محبت سے بنایا ہے اب اگر ہم ان جیسے ہو جائیں اور اتنی ہی شرافت اور ایمانداری سے کام کریں تو ہماری زندگی کا مقصد پورا ہو جائے۔ ان مشینوں میں نہ عورتیں ہیں اور نہ مرد۔ ایسے ہی ان کے چلانے والوں کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ سب مزدور ہیں سب مشینیں ۔۔"

مگر رات کو ضیافت کے وقت میں نے دیکھا ان مشینوں میں جان پڑ گئی تھی۔ اور زندگی اور انسانیت کا حق بھرپور طریقے پر ادا ہو رہا تھا۔

کارخانے میں کہیں لوہا گلانے کی مشین تھی۔ کہیں ڈھالنے کی، کہیں ماپتی تھی۔

تو کہیں نتاشہ تھی، ایک طرف پرزے ڈھالنے کی مشینیں تھیں تو دوسری طرف پوری تھا اور ڈیرا تھی۔

مگر بالشوائی تھیٹر میں پوری کا بازو نادیا کی کمر کے گرد تھا اور نتاشہ روستوف کے دل میں اپنی نشیلی آنکھوں کے تیر اتارنے میں محو تھی، عورت اگر موقع محل دیکھ کر عورت پن دکھائے تو سجتا ہے۔ یہ کیا کہ کالجوں، دفتروں اور محکموں میں نسوانیت کا پوٹلا سمیٹے چلی جارہی ہیں۔

جب یہ معلوم ہے کہ آج نہیں تو کل عورتوں کو مردوں ہی کے ساتھ کام کرنا ہے تو ہمیں یہ اقوال بھول کر نئے اقوال بنانا پڑیں گے:۔

(۱) کالج اور اسکول میں تم نہ ماں ہو نہ بیٹی ہو، نہ معشوقہ، صرف طالب علم ہو۔ اور باقی پروفیسر اور طلباء ہیں۔

(۲) دفتروں میں تم نہ محبت میں باوفا ہو نہ بے وفا۔ سیدھی طرح کام کرو اور نخرے بھول جاؤ۔

(۳) تمہارے گرد جو لوگ بھی بیٹھے ہیں، سب انسان ہیں۔ نہ مرد ہیں نہ عورتیں۔ افسر ہیں یا کلرک، یہ میز ہے یہ کرسی اور چپراسی۔ تم نہ کمزور ہو نہ طاقتور، نہ صنف نازک نہ صنفِ کرخت۔ تمہارا وہی کام ہے جس کے لیے تنخواہ لیتے ہو۔ جب تک پیشہ نہ بدل لو تمہیں قدرت نے اسی مصرف کیلئے پیدا کیا ہے۔ یہاں شوہر یا بیوی پھانسنے نہیں صرف کام کرنے آئے ہو۔ جسمانی یا دماغی طاقت یا کمزوری سے نہ فائدہ

اٹھاؤ نہ کسی کا نقصان کرو۔

(۴) صرف شادی ہی تمہاری منزل نہیں، کیونکہ شادی کر لینا منزل پر پہنچنا نہیں۔ اسے نبھانا اصل لمبی ریس ہے۔

مگر گرودیو تو کہتے ہیں: "اے عورت، تو آدھی عورت ہے آدھا خواب!"

کسی نے ان کی بیگم سے رائے لی ہوتی تو شاید یہ ہی کہتیں کہ گرودیو خود پورے کے پورے خواب تھے اور خواب کی حسین ترین تعبیر بھی!

مگر "عورتیں پیغمبر نہیں ہوتیں" — "عورتیں نبی نہیں ہوتیں" — "عورتیں مجذوب نہیں ہوتیں"

تو پھر کوئی اٹھ کر کہہ کیوں نہیں دیتا کہ "عورتیں عورتیں نہیں ہوتیں!"

خرید لو

"کیتھی کیتھی، سنو!"۔۔۔ میں نے اسے بار بار پکارا، مگر وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار اپنے نارنجی میولز پھٹکارتی ٹیوب اسٹیشن کی طرف لپک گئی

کیتھی مشکل سے پندرہ برس کی ہو گی، اس میں ابھی اپنی قوم کی سنجیدگی چپ اپنانے کا سلیقہ پیدا نہیں ہوا، وہ کسی کوک دیئے ہوئے کھلونے کی طرح بولے ہی چلی جاتی ہے۔ کبھی تو خود ہی سوال کر کے خود ہی جواب ٹکا دیتی ہے۔ پارے کی طرح تڑپتی ہوئی خوش رنگ، رس بھری کی طرح میٹھی، بالکل بے قرار چلتی کیا ہے بس بھاگتی ہے، ہر قدم پہ پر تولتی ہوئی، جیسے کوئی دم میں پھر سے اڑ جائے گی، فاختہ جیسے معصوم چہرے پر پھدکتی ہوئی منی سی ناک، گول گول سبز آنکھیں، چکنی بے داغ گٹا پارچہ جیسی جلد۔ جہاں میں ٹھہری ہوئی ہوں اس کے نیچے دو کمروں کے گھٹے ہوئے فلیٹ میں اپنی ماں مسز راس کے ساتھ رہتی ہے۔ مسز راس بلاؤز کے کارخانے میں کام کرتی ہے کیتھی اسکول

جاتی ہے۔

میری میزبان اس سے قطعی خوش نہیں۔ وہ کیتھی سے ہمیشہ نالاں رہتی ہے۔ اور میرے آنے کے بعد سے تو اس کی آمد و رفت بہت ہی بڑھ گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میری میزبان کے پاس قدِ آدم آئینہ ہے۔ کیتھی کسی بھی کام سے آئے سیدھی بھاگ کر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوتی ہے۔ اور اکثر بات بھول کر اپنے خد و خال پر تبصرہ شروع کر دیتی ہے۔ میری میزبان بسکٹوں کے کارخانے میں صبح آٹھ بجے سے شام کے آٹھ بجے تک کام در کام کر کے اچھا خاصہ کما لیتی ہیں، کیتھی جانتی ہے کہ انہیں وہ زیادہ پسند نہیں اس لیے وہ عموماً ان کے جاتے ہی ادپر کی طرف رپٹتی ہے۔

"وہ قطامہ گئی نا۔ شکر خدا کا!" وہ آئینے پر جھپٹنے سے پہلے کہتی ہے۔ اسکول سے جو وقت ملتا ہے۔ اس میں وہ بے بی سٹنگ کر کے یا پڑوسیوں کا کام کاج کر کے کچھ شلنگ کما لیتی ہے، اور پھر ساری کمائی میک اپ خریدنے میں صرف کر دیتی ہے۔ نہایت سستا اور نکما مال وہ دکانوں میں رکھے ہوئے رد کیے ہوئے سامان کے ڈبے کھکور کر نصف قیمت پر لے آتی ہے اس کے پاس اتنا تام جھام ہے کہ بمبئی میں اچھی خاصی دکان کھل سکتی ہے۔ اور پھر اتنی مقدار میں میک اپ تھوپتی ہے کہ بالکل ہوّا لگنے لگتی ہے۔ اور پھر وہ در و دیوار کو کوستی بیٹھی دوبارہ منہ دھوتی ہے۔ لوشنوں اور کریموں کے پُچارے

پھیرتی ہے، وڈر لگاکر پاؤڈر کی تہیں جمانی ہے، اس کے بعد آنکھوں پر جُٹ جاتی ہے۔ ڈھیر لوں آئی شیڈ پوز، مسکارا، آئی پنسل سے طرح طرح کے چھپاتے کاجل، پھر مصنوعی پلکیں جو نہایت سستی اور بھر بھری ہوتی ہیں۔ اور عموماً آڑی ترچھی چپک جاتی ہیں۔ اس پر بھی جی نہیں بھرتا، تو وہ پپوٹوں پر گوند لگاکر رنگ برنگی اَبرق بڑکتی ہے، بیچ بیچ میں شَل ہو جاتی ہے تو خوب ورزش کرتی ہے، ذرا دم آجاتا ہے۔ تو پھر لپ اسٹک کی باری آتی ہے۔ یہ کمبختی کے لیے بڑا ہی جاں سوز مرحلہ ہوتا ہے۔ کئی کئی رنگوں کی لپ اسٹک کے گھسّے پر گھسّا لگانے کے بعد اونٹ کسی کل سیدھا نہیں بیٹھتا تو وہ ٹیشو پیپر کا تازہ پیکٹ کھولتی ہے۔ اور نئے سرے سے نقاشی شروع کر دیتی ہے۔ اس عرصے میں کریموں اور پاؤڈروں کا پلستر چہرے کی کھینچ تان سے دانت نکوسنے لگتا ہے۔ وہ انجانی طاقتوں کو صلواتیں سُنا کر دھاروں دار رونے لگتی ہے۔ سارے میک اَپ کا ملبہ بن جاتا ہے۔ وہ پھر منہ دھوکر چھوٹی چھوٹی سسکیاں لیتی ہوئی از سرِ نو پچھاڑ شروع کر دیتی ہے۔ اس وقت میری عجیب حالت ہوتی ہے۔ جب وہ ایسے نازک مرحلوں پر پہنچتی ہے۔ تو میں بغیر ارادے کے دعائیں مانگنے لگتی ہوں ——— "اے پروردگار! اس نامراد کا میک اَپ ساتھ خیریت کے ختم کرا دے، تو تیری خدائی میں ٹوٹا نہیں آجائے گا"۔—— میری نبضیں اچھل رہی ہیں اعصاب چلے پر چڑھے ہوئے

ہلیں اڑاڑادھم کر کے یہ نئی عمارت بھی ڈھہ گئی تو میں جھیل نہ سکوں گی۔
میری سمجھ میں نہیں آتا، مسکارا لگانے کے لیے کیتھی کو قد آدم آئینے کی ضرورت کیوں پڑتی ہے اور شاید اس لیے کہ مصنوعی پلکیں لگانے کے بعد وہ ان کا تاثر اپنے سارے جسم پر آدھی ترچھی کھڑی ہو کر دیکھتی ہے۔ پیٹ کو گھونسے مار کر اندر کرتی ہے، سینہ باہر دھکیلتی ہے، پھر نہایت قاتلانہ انداز میں سر نیہوڑا کر نیم باز آنکھوں سے مفروضہ شکار پر بجلی گراتی ہے۔ مگر اسے کبھی اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ نہیں ہوتا۔
کبھی کبھی بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اس کے میک اپ کے ٹوکرے کو ڈسٹ بن میں ڈالوں اور دوں ایک دھول مردانے کے، کہ چل سیدھی بیٹھ اب کے جو آئینے کے پاس گئی تو ٹانگیں توڑ دوں گی۔
مگر اس کی، ماں اسے کچھ نہیں کہتی۔ باپ تو جب دو تین سال کی تھی، جب ہی نہ جانے کہاں اڑن چھو ہو گیا۔ ماں ہفتے میں پانچ دن کولہو کے بیل کی طرح جٹ کر کام کرتی ہے ہفتہ اور اتوار کو عیش مناتی ہے۔ پیر کو پھر کراہتی بڑبڑاتی کام پر چلی جاتی ہے۔ کیتھی پر جان چھڑکتی ہے، بغیر ڈارلنگ کہے گالی تک نہیں دیتی، اور جب ایک دم کیتھی پر فاقے کر کے جسم سنوارنے کا بھوت بیدار ہو جاتا ہے۔ تو مسز راسن خوب اسے روہانسی گالیاں اور کوسنے دیتی ہیں، مگر وہ کچھ نہیں کھاتی۔ مگر یہ اور بات ہے کہ میزبان کے لیکٹ،

کارن فلیکس، یہاں تک کہ کچی ترکاریاں تک نہیں چھوڑتی اسی لیے وہ عموماً ڈائٹنگ کے زمانے میں اور موٹی ہو جاتی ہے۔ اور جلد ہی خوف زدہ ہو کر توبہ کر لیتی ہے۔

نہایت چھوٹی سی بات پر وہ مجھ سے بڑی مانوس ہو گئی۔ ایک دن وہ ڈیٹ پر جانے کے لیے سج دھج کر قدِ آدم آئینے میں اپنا سراپا دیکھنے آئی تو ایسے ایسے پوز مارے کہ رستے گوند سے چپکی ہوئی مصنوعی پلکیں اچٹ کر کھٹن قالین میں گم ہو گئیں، باوجود نائلون کے وگ اور پیڈ بڈ برا کے وہ بچوں کی طرح بسور پڑی۔ مجھے ترس آ گیا، میں نے ہاتھ پانی میں بھگو کر قالین پر پھیرا، اتفاق سے پلک چپک آئی، میں نے اپنے میزبان کا قیمتی مصالحہ چرا کر چپکا دی پلک ایسی ثابت قدم نکلی کہ پیچ پارٹی کی گھمسان کے بعد بھی سلامت رہی، وہ مصالحہ صرف چھ گنی والی پلکوں کے ساتھ ملتا تھا، جسے خریدنے کی کیتھی کی حیثیت نہ تھی۔ اس لیے وہ اکثر مجھے اس چوری پر مجبور کرتی ہے۔

اور آج جب میں نے اسے پکارا، تو وہ سنی ان سنی کر کے ٹیوب اسٹیشن میں گھس گئی ——— "آنے دو بھتنی کو، کبھی جو دروازہ کھول جاؤں۔ میزبان تو خوش ہو جائیں گی، جب اس کا آنا جانا بند ہو جائے گا، اس کے ویسے ہی اس سے پر جلتے ہیں۔"

پھر میں نے دیکھا، دور پاس آگے پیچھے بیسیوں کیتھیاں کٹک کٹک

چلی جا رہی ہیں، بال برابر فرق نہیں، ایک ناپ کے سیدھے تنکوں جیسے روپہلی بال، کاجل میں لتھڑی آنکھیں، نارنجی میولز، نارنجی منی اسکرٹ اور سفید جھگ بلاؤز۔

اوہ، تو یہ کیتھی نہیں، گئے ہفتے کا فیشن ہے جو بگولے کی طرح کیتھی کی ہم عمر لڑکیوں کو لپیٹ لے گیا، اور وہ ٹی وی پر بھی کیتھی نہیں تو کو تھی، عین مین کیتھی۔

اسی لیے دو تین دن سے کیتھی بلبلاتی پھر رہی تھی، موت اور زندگی کا سوال تھا۔ اس نے نارنجی منی اسکرٹ کے لیے ماں کا ناطقہ بند کر دیا۔ اس کی تڑپ دیکھ کر دم بوکھلایا جاتا تھا۔ فیشن چلے اور کوئی بد قسمت اسے اسی دم اختیار نہ کر سکے تو لعنت اس کی زندگی پر۔ مجھے یقین تھا کہ ہفتہ کی شام تک نارنجی اسکرٹ اور میولز نہ مہیّا ہو سکے۔ تو کیتھی کی میت اٹھ جائیگی۔ میرا خیال سچ نکلا۔ بس اسٹینڈ پر کیتھی سر سے پیر تک مکمل تو کو بنی کھڑی تھی۔ مجھے اس لڑکی کے عزم کا قائل ہونا پڑا۔ سفید اسکرٹ اس نے راتوں رات رنگا، ہیر ڈرائر سے سکھایا، موڑ کر اونچا کیا، نارنجی پالش سے بھورے جوتے کو شوخ نارنجی رنگا، بلاؤز ماں کا پہن لیا۔ ماربل آرچ ٹیوب اسٹیشن سے نکلتے ہوئے میں نے سوچا، یہ اس ترقی یافتہ ملک کی ترقی یافتہ اشتہار بازی کا ہے کہ بمباری۔ کیا نشانے ہیں، مجال ہے جو چوک جائیں۔

جب کبھی نیا فیشن آتا ہے، تو فوجی ناکہ بندی سی شروع ہو جاتی ہے۔ چیکے چپکے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں تیار کر کے ہر اسٹور کی ہر شاخ میں مال پہنچا دیا جاتا ہے۔ ہر شوکیس سجا دیا جاتا ہے اور پھر حملہ شروع ہوتا ہے۔ خرید لو —— جلدی —— فوراً —— نہیں تو مٹ جاؤ گے، تباہ ہو جاؤ گے —— ساری عمر سر دھنو گے —— وقت جا رہا ہے، اسٹاک ختم ہو جائے گا، ابھی، اسی دم نہ خریدا تو قیامت آجائے گی، عاشق منہ پھیر لیں گے، شوہر طلاق دے دیں گے، باس نوکری سے نکال دیں گے، ساری عمر کنواری یا طلاقن بن سکو گی، نقد خرید —— چلو قسط پر، ادھار ہی خرید لو، ورنہ یہ معمہ حل کرو تو مفت ہی لے جاؤ —— نقد خریدو، تو ساتھ میں بسکٹ کا ڈبہ مفت —— مُفت —— دو ایک دم خریدو تو صابن کی ٹکیاں بالکل مفت۔

اسٹور طرح طرح کے سامان سے اٹا اٹ بھرے ہیں، سڑک پہ نکلو تو شوکیس چنگھاڑ رہے ہیں۔ ٹی وی کی پکار، مجنوط اکواس کیے دیتی ہے،

"روٹھے ساجن کو منانا چاہو تو فلاں جھاڑو فوراً خریدو۔ باس کو کوڑیا غلام بنانا چاہو تو اسی دم نیا چولھا خریدو —— میاں طلاق دے رہا ہے۔ دوسری عورت پر ریجھ رہا ہے، کیونکہ وہ ہمارا بغل گند لوشن اور منہ کی سڑاند دور کرنے والا پیسٹ استعمال کرتی ہے۔ گھر نہ بگاڑو، تم بھی خرید لو اور ساتھ

میں روٹھ کر جاتے ہوئے ساجن کی تصویر —— اس کے پاس خریدنے کے لیے بعض واری صدقے ہوتے ہیں، عاشقِ صادق کا منظر۔ بچے مسکرا رہے ہیں —— پھول برس رہے ہیں۔"

"اچھی نوکری چاہیے تو جسم کو بکھیلا اور ننگا دکھانے والی براخریدو!"

"ڈیٹ پر مدعو ہونا ہے تو ہماری کمپنی کا بنایا ہوا نکل کا سیٹ خریدلو!"

ان باتوں کے کان عادی ہو جاتے ہیں، یا تجربے ناکام ثابت ہوتے ہیں تو اور بھی لذیذ قسم کے پھندے ڈالے جاتے ہیں

"اس ٹب میں دونوں ساتھ نہاؤ، عاشق کبھی دغا نہ دے گا۔"

"اس کمبل میں خواب زیادہ سہانے ہوں گے۔"

"یہ پلنگ (تصویر) یوں لیٹو (تصویر) فردوسِ بریں کے مزے لوٹو!"

"اس کرسی پر محبوبہ کو بٹھا کر مزے لو۔" (تصویر —— محبوبہ قطعی کپڑوں سے بیزار نہایت اٹھلاتی ہوئی)

"یہ میدہ کیک بنانے میں استعمال کرو، وہ تمہیں گود میں اٹھا لے گا۔" (تصویر —— ایک ہیرو کی گود میں ٹانگیں چلاتی حسینہ)

"پڑوسن کا میاں کتنے بوسے لیتا ہے، کیونکہ وہ ہماری نئی استری استعمال کرتی ہے، تم کیوں ترسو؟"

"زمانہ جیٹ کی رفتار سے ترقی کر رہا ہے۔ ہر لمحہ چیزوں کی شکلیں بدل رہی ہیں۔ گذشتہ سال کی مرسیڈیز نئے ماڈل کے سامنے جیسے چھکڑا، پرانی استری نئی کے سامنے بالکل کھٹارا، اور آج خریدو، کل پرانی۔ بس خریدتے جاؤ، کڑھتے جاؤ، ترستے جاؤ، پھر خریدو، پھر پچھتاؤ، ہر چیز ہی سے اتری ہوئی۔ سب کچھ پاکر بھی وہی محرومی، نامرادی اور احساسِ کمتری۔

کچھ دن بعد میں اپنی میزبان کے یہاں سے لندن آگئی۔ ایک دن یونہی پکاڈلی پر سے گذر رہی تھی کہ میری آنکھوں نے پھر دھوکا کھایا، محبت کے دیوتا ایروز کے پتلے کے نیچے سیڑھیوں پر وہ میلے کچیلے کپڑوں کے انبار میں الجھی پڑی ہوئی تھی، خواہ سردی ہو، یا گرمی، رات ہو یا دن، یہ سیڑھیاں کبھی خالی نہیں رہتیں، اِدھر اُدھر کے شرابی، چنڈو باز اور چرسیئے لیٹے بیٹھے، لڑکھڑاتے ان سیڑھیوں پر چپکے رہتے ہیں۔

اگر وہ کیتھی ہی تھی، تو ڈیڑھ مہینے کے عرصے میں اس میں کتنا انقلاب آگیا تھا!—— اس کے کپڑے بے انتہا میلے اور بوسیدہ تھے۔ پوڈر، روژ کا چہرے پر نام و نشان نہ تھا۔ اس میل کے انبار میں یہ اندازہ لگانا قطعی ناممکن تھا کہ کون لڑکا ہے اور کون لڑکی، سوا ان لڑکوں کے جن کے چہرے پر داڑھیاں تھیں، سب ہی کے لمبے بال تھے۔ انتہائی چست پتلونیں اور بڑے بڑے سوئٹر پہنے ہوئے تھے، زیادہ تر ننگے پیر تھے۔

ہاں وہ کینیقی ہی تھی ـــــ اگرچہ وہ رس بھری جیسی تازگی ختم ہو چکی تھی، روپہلی مصنوعی بال غائب تھے۔ اس کے اپنے نارنجی بالوں میں منوں خاک بھری تھی۔ کبھی وہ دائیں بازو والے لڑکے کا نہایت گہرا بوسہ لیتی، پھر سانس لینے کو ذرا رکتی تو بائیں بازو پر پھسلے ہوئے لڑکے پر جھپٹ جاتی۔ وہ بڑے انہماک سے مشغول تھی، مگر اس کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔ آنکھیں سپاٹ۔ اس کے اوپر والی سیڑھی پر ایک نگرو لڑکی چت پڑی اپنے پیٹ میں بھنور قائم کر رہی تھی۔ اس کے پاس بیٹھا ہوا ایک سوکھا سڑا لڑکا فوارے سے ہاتھ بھگو کر اس کے آبنوسی پیٹ پر بوندیں ٹپکا رہا تھا، جیسے ہی بوند پڑتی لڑکی "قیں" سے ایک گھٹی ہوئی آواز گلے سے نکال کر بالکل ساکت ہو جاتی۔ پھر پیٹ چلانے لگتی۔ نہ جانے کتنی دیر سے یہ احمقانہ شغل چل رہا تھا۔ اور میرے سوا کوئی ان کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔

ایک طرف ایک میلا سا ڈھیر سو رہا تھا۔ اس کے پاس ایک لمبی لمبی سنہری جٹاؤں والا لڑکا اکڑوں بیٹھا ایک پنسل کی طرح بالنسری بجا رہا تھا۔ اس کے جسم پر ایک نامعلوم رنگ کی بے حد تنگ پتلون تھی۔ باقی جسم میلی کی پٹریوں سے ڈھکا ہوا تھا، پیروں میں بالکل نئے کلاتیو کے کام کے کولھاپوری چپل تھے، ایک گلگلاسی بھوری بھوری لڑکی اس کے کندھے پر سر رکھے اونگھ رہی تھی، کبھی ایک دم چونک کر لال لال زبان نکال کر لڑکے

کے میلے کندھے کو چاٹتی، پھر سو جاتی۔

میں نے قریب جا کر دیکھا، تو اس لڑکے کے سامنے سیڑھی پر ایک بالشت بھر لمبا کالا سپنولیا کنڈلی مارے پڑا تھا۔ ایک دوسری لڑکی اس کے گھٹنے سے لگی سانپ سے کھیل رہی تھی۔ کبھی اسے انگلیوں میں الجھا لیتی، کبھی ہتھیلی پر رکھ کر اسے جگانے کی کوشش کرتی، مگر سانپ نہایت ٹھس اونگھے جا رہا تھا — بالکل ان لڑکوں اور لڑکیوں کی طرح دنیا سے بے نیاز اپنے خیالوں میں گم۔

بیچ چوراہے پر یہ ڈرامہ کھیلا جا رہا تھا، اور اس کے آس پاس زندگی جیٹ کی رفتار سے لپکی چلی جا رہی تھی۔ ڈبل ڈیکر بسیں، لمبی چوڑی موٹریں اسکوٹر سنسناتے گزر رہے تھے۔ وہی بار میں غول کے غول، ہنس مکھ نوجوانوں کے آ رہے تھے، سینما ہال کے سامنے ٹکٹ کی کھڑکی کھلنے کے انتظار میں کیو بڑھتا جا رہا تھا۔ مائیں پرام میں بچوں کو بٹھائے لپکی چلی جا رہی تھیں۔ ایک لڑکا گٹار پر کوئی آئرش گیت گا رہا تھا۔ اس کا ساتھی کوئی پچاس برس کا لمبا تڑنگا، انسان چست پتلون اور سفید بے داغ قمیض جس میں فرل اور بلیں جھول رہی تھیں پہنے ٹیپ ڈانس کر رہا تھا۔ کیو میں کھڑی لڑکیاں گٹار کی دھن پر تھرک رہی تھیں۔ اور لڑکے کو میٹھی میٹھی نظروں سے گھور رہی تھیں۔ لڑکا غیر معمولی طور پر حسین تھا۔ اور اس کے چہرے پر فرشتوں جیسی معصومیت اور نور تھا۔

سامنے ایک سپاہی لپشت پر ہاتھ باندھے فلسفیوں کی طرح کسی سوچ

میں ڈوبا ٹہل رہا تھا۔

کوئی نظر اٹھا کر بھی اس میل کے انبار کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ جیسے وہاں کچھ بھی نہ ہو۔ جیسے میں نے صرف جادو کی عینک پہن رکھی ہو۔

کیتھی! ــــ نہیں یہ شبہ نہیں، یہ واقعی کیتھی تھی۔ کیونکہ تھوڑی ہی دیر میں اس نے اپنی غیر حاضر آنکھوں کو ایک نقطے پر لا کر مجھے پہچان لیا اس کے دانتوں پر چڑھے ہوئے تار چمک اُٹھے، وہ پھر بے نیاز ہو کر دائیں بازو والے لڑکے کی طرف جُٹ گئی۔ کیونکہ بائیں بازو والے کے پاس سوئی ہوئی قیامت جاگ اٹھی تھی اور اس پر بیطرح حملہ آور تھی۔

مگر وہ لڑکی بالکل اسی رفتار سے پیٹ چلا رہی تھی، پانی کی بوند پر ساکت ہو جاتی، دم بھر کے لیے کیتھی لڑکے کا پنڈ چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہوئی۔ اس نے مجھے سیڑھیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ سمجھی ہو گی میں شاید برا مان جاؤں گی، مگر میں فوراً پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔

لڑکے نے اس دخل در معقولات پر احتجاج کیا مگر کیتھی اسے پرے دھکیل کر میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ میں نے اسے بتایا کہ فی الحال لندن میں آ گئی ہوں جلدی جانے والی ہوں۔

"گھر جاؤ تو حلیمہ سے کہہ دینا، جانے سے پہلے اس سے ملنے آؤں گی" ــــ میں نے کہا۔

"گھر؟ —— اونہہ، گھر نہیں" —— وہ پیر پسار کر بیٹھ گئی۔

"کیوں؟ کیا مما سے جھگڑا ہو گیا"؟

"نہیں —— اب میں کوئی بچی تو نہیں!"

"کون کہتا ہے بچی ہو، مگر......"

"میں نے خود کو پا لیا ہے" —— وہ نہایت درویشانہ انداز میں بولی۔

"کب؟" —— میں نے مذاق اڑانا چاہا۔

"دو ہفتے ہوئے، جیل سے نکلنے کے بعد...... میری وکی سے ملاقات ہوئی" —— اس نے کسی خاص انسان کی طرف نہیں، پورے انبار کی طرف اشارہ کیا۔

"جیل؟...... جیل؟" —— میں ہکلانے لگی۔

یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ وہ دکانوں پر سے چیز اٹھاتی ہوئی پکڑی گئی تھی۔ اس نے مجھے فخریہ بتایا کہ پہلے، وہ اسے نہایت شرم کی بات سمجھتی تھی، مگر اس کے سب ساتھی اس فن میں ماہر تھے، اور یہ کافی رومانٹک بات سمجھی جاتی تھی، شاید مارلین منیرو یا صوفیہ لورین بھی شوپ لفٹنگ کیا کرتی تھیں، ٹی، وی پر دکھایا گیا تھا، یہ بڑے بڑے اسٹالوں سے سامان اُچک لینے کی عادت بڑی عام ہے اور بچوں سے زیادہ بوڑھیاں اس لت میں گرفتار ہیں، اسٹال پر بظاہر کوئی نہیں دکھائی دیتا، جو چیز چاہے بٹوے میں ڈال لو، کیونکہ سب خود

ہی چیزیں چنتے ہیں اور پھر کاونٹر پر جا کر دام دیتے ہیں، لیکن نہ جانے کیسی ٹیگرے جیسی نظر والے کہیں سے چھپ کر دیکھتے رہتے ہیں، کبھی پکڑ لیتے ہیں تو بڑی کالے دے مچتی ہے۔ اس دفعہ جب کیتھی نے کچھ انڈرویئر اُڑائے تو دھر لی گئی اور دو ہفتے کے لیے اصلاحی جیل بھیج دی گئی، وہاں چودہ طبق روشن ہو گئے، نشہ اور سگریٹ اس نے پہلی بار وہیں پیا، چھوٹ کر وہ گھر سے غائب ہو گئی، مختلف گروہوں کے ساتھ رہتی ہے، کپڑے لتے کا تو سوال ہی نہیں، کھانا کہیں سے مل جاتا ہے، کوئی دے ہی دیتا ہے، چین ہی چین ہیں بس پیار ہی پیار ہے۔ زندگی میں کئے جاؤ پیار ـــــ اسکول سے الگ جان چھوٹی۔

"تھوڑی دُبلی ہوئی نا؟" ـــــ اس نے پیٹ میں گھونسے مار کے کہا۔

"ہاں، کافی!" ـــــ میں نے اطمینان دلایا ـــــ "مگر وزن تو نہ گھٹا ہو گا، اتنا میل......" وہ قطعی متاثر نہ ہوئی۔

"یہ میرا اپنا میل ہے" ـــــ اس نے بالکل مہیش یوگی کے انداز میں کہا۔

ساری چلبلاہٹ، بے قراری اور سیمابیت پر جیسے اوس پڑ گئی ہو۔ ایک دم سنجیدہ، نرم گفتار، سارا بچپن غائب۔

تو کیتھی نے خود کو پالیا! ـــــ وہ دو ہفتے میں کتنی بردبار، کتنی بوڑھی ہو گئی۔ اتنی جلدی اسے جنت کی کنجی مل گئی۔ اس کی سمجھ میں آگیا کہ عاشق بٹورنے کیلئے نہ بجلی کی جھاڑو چاہیے۔ نہ نئے ماڈل کی استری نہ اسٹین

ٹینس اسٹیل کے برتنوں سے پیار ملتا ہے، نہ نئی وضع کے مکسر سے زندگی کا رس ٹپکتا ہے، سب اشتہار ئیے جھوٹے ہیں، ورغلاتے ہیں، چاہے جوتے بیچیں، چاہے سیاسی گورکھ دھندے، خواب آور پلنگ ہوں یا حکومت کی کرسیاں سارا مال گھن کھایا ہوا ہے۔ تم سب چور ہو، اچکے ہو، ہم تمہاری کوئی بات نہیں مانیں گے، تمہاری بنائی ہوئی درسگاہوں میں ننگے ناچیں گے۔ نشے میں ڈوب کر تمہاری دنیا کو بھلائیں گے۔ تمہارے شاہراہ عام پر ہنی مون منائیں گے۔

اور کمیٹی پاس والے پر جٹ گئی۔

مجھے وحشت ہونے لگی ـــــ یہ میں کہاں بیٹھی ہوں، کیوں بیٹھی ہوں؟ آس پاس سے کون سا نخہ سمیٹ کر اپنے بچوں کی ذہنی نشو ونما کی خاطر لے جاؤں؟

بچہ کیچڑ میں مچلا ہوا ہے، ماں کڑھ رہی ہے۔ یہ میلے کچیلے بچے جان بوجھ کر چورا ہے پر یہ ڈرامہ کھیل رہے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ بظاہر بے پروائی سے گذر جانے والے اتنے بے نیاز نہیں۔ انہیں کن آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر کڑھ رہے ہیں، سلگ رہے ہیں۔ کسی نے ضرور چھپ کر تصویریں لی ہوں گی، جو چھپیں گی، کوئی جرنلسٹ مضمون کیلئے۔ جلدی جلدی نوٹ لے رہا ہو گا، کوئی مصنف اپنی نئی ناول کے لیے مواد جمع کر رہا ہو گا۔ اب دنیا کے مدبر ملک اور قوم کے وقار کی دہائی دیں گے۔ نفسیات کے ماہر فتوے صادر کریں گے۔ ان کے سدھار کے لیے محکمے قائم ہوں گے، کمیٹیاں بنیں گی، ان کا نام تاریخ میں لکھا جائے گا۔

بس اسٹینڈ کی طرف جاتے ہوئے میں نے دیکھا ۔

"عاقبت سنوارنا چاہتے ہو، تو حضرت عیسےٰ کا مجسمہ خریدو! صرف چھ شلنگ، دو کے خریدار کو صرف گیارہ شلنگ میں!"

ایک بڑی بی بڑی حسرت سے مجسموں کی قطار کو تک رہی تھیں، پھر ان کی نظر مارگ اینڈ اسپنسر کے گرینڈ سیل کے اعلان پر پڑی۔ بڑی دیر سے وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھیں کہ اپنی عاقبت سنواریں یا روٹھی ہوئی جوانی کو منانے کا سامان کریں!

میری بس آنے سے پہلے انہوں نے فیصلہ کر لیا ــــــ اور مارگ اینڈ اسپنسر کے جھلملاتے ہوئے میک اپ کے اسٹال کی طرف بڑھ گئیں۔

نوالا

پوری چال میں ایک وندر مچا ہوا تھا — ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے کسی کھولی میں سانپ نکل آیا ہے یا کسی کے یہاں بچہ پیدا ہو رہا ہے۔ عورتیں ایک کھولی سے دوسری کھولی میں گھس رہی تھیں۔ شیشیاں، بوتلیں ڈبے لئے سب کی سب سرلابین کی کھولی کی طرف لپک رہی تھیں۔ جیسے سرلابین کا آخری وقت ہو اور ساری پڑوسنیں اپنی سی کرنے پر تلی ہوں۔

ایک طرح سے تو سرلابین کا واقعی آخری وقت تھا۔

ان کی ٹرین بس چھوٹنے ہی والی تھی۔ وہ پورے تینتیس برس کی ہوتی اگر ان کے دور اندیش والدین نے پرہیا کر کے سارٹیفکیٹ میں ان کی عمر کے پورے پانچ سال نہ ہڑپ کر لیے ہوتے۔

مگر کاغذ کی سٹر ایسا زبردست سہارا نہیں ہوتی۔

وہ یوپی کے کسی گمنام سے گاؤں کی پیداوار تھیں، مگر بمبئی میں اتنے سال رہیں کہ وطن کو بھول بھال کے بمبئی کی ہی ہو گئی تھیں۔ ان پر کسی صوبے کا ٹھپا نہیں تھا کوئی

انہیں گجراتی سمجھتا. کوئی مارواڑی اور سندھی بس بھگت سرلا بہن ہو گئی تھیں.

مرلا بہن کے ای. ایم ہاسپٹل میں نرس تھیں مہنگائی الاؤنس ملا کے دو سو چالیس روپے ملتے تھے. بارہ روپے کمرہ کا کرایہ دے کر اتنا بچ جاتا تھا کہ بڑے ٹھاٹ سے رہتی تھیں. ہاسپٹل سے مرہم پٹی کا سامان، اے. پی. سی کی گولیاں، مرکیورِی کروم، اصلی گلیسرین اور پیٹنٹ دواؤں کے سیمپل لا کر مفت تقسیم کیا کرتی تھیں. ان کا کمرہ آس پاس کے علاقے کے لیے اچھا بھلا ہسپتال تھا.

سرلا بہن بڑے کام کی چیز تھیں. اوپر سے شکل صورت کے ساتھ ساتھ چال چلن ایسا تھا کہ کبھی کسی کی گرہستی پر شے پڑنے کا خدشہ نہیں ہوا یہی وجہ تھی کہ وہ بے انتہا ہر دل عزیز تھیں، جدھر نکل جاتیں ان کے جنائے ہوئے بچے کلبلاتے روتے بسورتے نظر آتے. لوگ ان کے قدموں میں آنکھیں بچھاتے، ہر سودے والا، ہر دوکاندار انہیں رعایت سے مال دیتا، وہ مول تول کرتی جاتیں. اور مریضوں کے حال چال پوچھتی جاتیں.

کیوں رے تکسی، بہو کی کمر کا درد کیسا ہے، ارے شاکر میاں آمنہ بی بی کے پیروں کی سوجن اتری کہ نہیں. شام کو لے آنا. انجکشن دے دوں گی. ارے اور جنی تیرے گھٹنوں کے درد کا کیا ہوا؟ تیرا مرد پھر دارو پی کر آنے لگا ہے؟"

وہ خیر خبر پوچھتی، گام دیوی کے نکڑ والے بس اسٹاپ پر پہنچ جاتیں اور ان کے مریض ان کو دعائیں دیتے رہ جاتے.

بس سب کو یہی دکھ تھا کہ سرلا بہن اب تک کنواری بیٹھی تھیں. اگر شادی کے

بعد بیوہ ہو گئی ہوتیں، یا میاں چھوڑ کر چلا جاتا تو بھی صبر آجاتا، مگر یہ تو نرا اندھیرا تھا کہ ان کی ریل چھوٹ رہی تھی اور جیون ساتھی کا دور دور نشان نہ تھا۔ سب کے سر ان کے احسانوں کے بوجھ سے جھکے ہوئے تھے۔ وہ سب کے لیے کرتی تھیں، لیکن ان کے لیے کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ شہر بمبئی ہے یہاں زندگی سرپٹ دوڑتی ہے۔ یہاں مشاطہ اور نائین کا فیشن ختم ہو چکا ہے۔ یہاں تو بس آنکھ لڑ جاتی ہے اور بیاہ ہو جاتا ہے۔

سرلابین فلم ہیروئن نہ سہی، ڈراؤنی بھی نہ تھیں۔ کہ کوئی اللہ کا بندہ ان پر عاشق ہی نہ ہو جائے۔ آدمی کا بچہ تھیں۔ باپ بچپن ہی میں مر گئے ماں ہمیشہ کی روگی۔ سنگر مشین کے بل بوتے پر انہیں پالتی رہیں پھر جب بیٹی کمانے لگی۔ تو وہ بالکل ہی ٹوٹ گئیں۔ دو ایک بار اچنبا ہوا انہیں بیٹی کے بیاہ کا خیال آیا، مگر اس کے خیال کے کوئی معقول صورت اختیار کرنے سے پہلے ہی وہ چل بسیں۔ وہ دن اور آج کا دن سرلابین ایسی اپنے کام میں جٹیں کہ شادی کا خیال تک نہ آیا خیال آیا بھی ہو گا، تو انہوں نے کسی سے تقاضا نہیں کیا۔ اور تھا بھی کون جس سے تقاضا کرتیں کہ بھئی ہمارا بیاہ کرا دو!

کہتے ہیں اگر کوئی کنواری کنیا بیٹھی رہے تو دھرتی کی چھاتی پر بوجھ ہوتا ہے اور دھرتی کے اس کمرب کا پاپ سب کو لگتا ہے۔ کم از کم سرلابین کے جان نثاروں کا تو یہی عقیدہ تھا ان کی نیکی اور پارسائی قابلِ ستائش تھی مگر نیکی کی بھی ایک حد

ہوتی ہے۔ یہ تو ان سے کوئی نہیں کہتا تھا کہ بابا کسی بھی ایرے غیرے نتھو خیرے کے گلے میں باہیں ڈال کر جھول جاؤ مگر عورت کے چند گر ہیں جنہیں اگر سلیقے سے استعمال کیا جائے، تو کوئی مضائقہ نہیں. آج کل تو بر پھانسنا اکیلے ماں باپ کے بس کی بات بھی نہیں. اچھی شریف زادیاں! ابھی اب تو چڑیا خود ہی گھیرتی ہیں، پھر شرما کر سر جھکا کر ڈور والدین کے ہاتھ میں تھما دیتی ہیں. کوئی داغ نہیں لگتا. کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا. والدین بھی سرخرو دلہا دلہن بھی مگن. یوں ہوا کرتی ہیں۔ شادیاں مگر نہیں ہو پاتیں، تو بے چاری سرلا بہن جیسی مسمسی گالوں کی، جو دنیا کے زخموں پر پھاہا رکھنے میں ایسی گم ہیں کہ اپنا کچھ ہوش ہی نہیں، سب کے دکھ بانٹتی ہیں. راتیں آنکھوں میں کاٹ دیتی ہیں، نوزائیدہ بچے ہتھیلیوں پر جھیلتی ہیں —— اور پھر اپنی نیم تاریک کھولی میں الٹا سیدھا نگل کر سونی کھاٹ پر پڑ جاتی ہیں، کوئی اتنا نہیں جو ان کی تنہائی کے رستے ہوئے زخموں پر پھاہا رکھے.

یہ اتنا بڑا جیتا چنگھاڑتا بمبئی، کیا یہاں کوئی اکیلا کوئی عورت کے پیار کا بھوکا نہیں؟ کسی عورت کے لمس کی چاہت، سرلا بہن کسی کی محتاج نہیں. اپنا کماتی کھاتی ہیں، ساری چال میں ایک نگینہ سا کمرہ ہے جو کسی فلیٹ سے کم نہیں —— صوفہ کرسی بھی ہے اپنا الگ سنڈاس بھی —— اب اور کیا چاہیے اس دنیا میں،

لوگوں کا کیا ہے، کنوارے تو آنکھوں میں کھٹکتے ہیں ہر دم شادی کی دعائیں، شادی کے تقاضے. لو بھئی شادی کر لی تو بچے کی فرمائش. ایک بچہ ہوا تو یہ الاہے کہ

اے ہے بس ایک ہی، چلو دوسرا پیدا کیجیے ـــــ مگر سرلا بہن کو بھی یقین نہ ہوا تھا کہ وہ سدا کنواری ہی رہ جائیں گی، کوئی تو ہوگا، اس یہاں سے وہاں تک پھیلی دنیا میں ـــــ کوئی ایک اللہ کا بندہ ہے۔ جسے خدا نے انکی زندگی کا حصہ دار بنایا ہو گا یہ اور بات ہے کہ وہ اسے ڈھونڈ نہیں پائیں لوگوں کے کہنے سے انہیں اور بھی خیال آنے لگا۔ مگر جب بھی انہوں نے کسی کو اس خیال سے دیکھا وہ شجر ممنوعہ ثابت ہوا اور اپنی بیوی کی پوشیدہ بیماریوں کا رونا لے بیٹھا۔ کچھ وقت ساتھ گذارنے کو تو بہت سے نیا ملے مگر ہاتھ پکڑ کے نبھانے کے خیال سے بارات لے چڑھنے کا ارمان کسی کے دل میں نہ جھانکا۔ ہاسپٹل میں کبھی کسی نے گہری گہری پراسرار آنکھوں سے انہیں نہ دیکھا، کبھی کسی نے انہیں ہٹ کر راستہ دینے کی ضرورت تک نہ محسوس کی لوگ دندناتے نکل جاتے اور وہ آڑی ہو کر دیوار سے لگ جاتیں۔

گام دیوی کے ناکے سے وہ روز صبح کو پونے آٹھ بجے والی بس پکڑا کرتی تھی۔ بس میں سب ہی روز کے جانے پہچانے ہوائے کرتے تھے۔ سب کی سیٹیں کچھ مقرر سی ہو گئی تھیں۔ اس دن وہ بے خیالی میں اپنی سیٹ کی طرف بڑھیں۔ ایک اجنبی کو وہاں بیٹھا دیکھ کر انہوں نے لبالب بھری ہوئی بس پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور بس کے بیچ میں لٹکی ہوئی رکاب پکڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ اجنبی نے انہیں سر سے پیر تک دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھ جائیے ـــــ" وہ رکاب پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور اخبار پڑھتا رہا۔

انہوں نے پہلے تو بوکھلا کر جھٹ سے اپنا بٹوہ دبوچا کہ کہیں کوئی چور اچکّا تو نہیں پھر سمجھیں کسی پیشینٹ کا شوہر ہوگا اور ابھی پیروں کے ورم اور کمر کے دکھ درد کا قصہ شروع کر دے گا۔ مگر رکاب پکڑے وہ کھڑا جھولتا رہا اور اخبار پڑھتا رہا۔ جب انہیں یقین آ گیا کہ وہ خود بھی کسی مہلک مرض میں مبتلا نہیں تو وہ سناٹے میں رہ گئیں ایسا تو کبھی ہوتا نہیں!

مگر دوسرے دن جب پھر یہی ہوا کہ وہ بس پر چڑھیں اور اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور کھڑا ہو گیا تو وہ بیٹھنے کو تو بیٹھ گئیں مگر بڑی کسمسائیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کریں۔ جی چاہا کہ اسے مٹھی بھر سلفا کی گولیاں ہی دے دیں۔ کہیں زخم تلاش کر کے کیوری کروم کا پھاہا رکھ کے سفید جھک سی پٹی باندھ دیں، مگر اس کی مکمل صحت سے ان پر اوس پڑ گئی۔ ایک کھروںچے تک کا نشان نہ تھا۔ وہ بس میں بے تعلق سا، کھڑا جھولتا رہا اور اخبار پڑھتا رہا۔

تیسرے دن جب یہی حادثہ ہوا تو مس لابین کے چھکے چھوٹ گئے۔

"نگوڑے کا ہے کو مجھے روز روز سیٹ دیتا ہے، کیا تیرے اماں بہنیں نہیں کلموہے" ان کا جی چاہا اسے کسی بات پر خوب جلی کٹی سنائیں، مگر وہ ایسا بے تعلق سا کھڑا جھول رہا تھا کہ انہیں بات بے تکی سی لگی۔

جب ہفتہ بھر یہی دستور چلتا رہا تو مس لابین بالکل اتھل پتھل ہو گئیں۔ خدمت گذاریوں کی تو وہ عادی ہو چکی تھیں۔ کسی کا احسان اٹھانے کی ان میں عادت نہ تھی۔

ان کے دل پر بوجھ بڑھنے لگا. ڈیوٹی پر انہیں بار بار خیال آتا کہ کیا کریں، دوسری بس پر چلیں تو وقت پر پہنچنا ناممکن.

سرلابین کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے وہ دنیا سے روٹھی، روٹھی رہنے لگیں۔ جیسے کوئی ان کے ساتھ سخت زیادتی کر رہا ہو. ان کا مزاج بڑا نازک ہو گیا، اب وہ بات بات پر الجھ پڑتیں. بے بات کے رونے لگتیں. ڈیوٹی سے لوٹتیں تو آنکھیں بند کر کے کھاٹ پر پڑ جاتیں. نہ کھانے کی سدھ بدھ، کسی کو کچھ دکھ درد بھی ہوتا تو پاس آتے ڈرتا ——

"سرلابین کو عشق ہو گیا ہے ——" ستو گرہ کٹ نے رام دئی کو بتایا ——

"در موئے، تیری کھاٹ کھڑے، سرلابین تو دیوی ہے دیوی" رام دئی نے ستو کی سات پشتیں تو م ڈالیں.

"میں سچ کہہ رہا ہوں"

کیا کہہ رہا ہے، تیرے منہ میں بھوبل.

مگر جب ستو گرہ کٹ نے بتایا کہ گام دیوی کے ناکے پر اس کی بزنس ہوتی ہے. ہر ایک کو تولنا، پرکھنا، اس کی جیب کو ہلکا کرنا، اس کا روز کا کام ہے. ایک عدد بابو روزانہ اپنی سیٹ سرلابین کو دے دیتا ہے اور خود کھڑا سفر کرتا ہے. آج سے نہیں ہفتوں سے یہ قصہ چل رہا ہے اور معاملہ قطعی پٹتا نظر آ رہا ہے.

"ہائے میں مر جاؤں!" رام دئی نے چھاتی کوٹ لی اور دوڑی دوڑی شبو کے

پاس گئی، شبلو بھی سناٹے میں رہ گئی پھر دونوں مل کر سعادت کی بہو کے یہاں گئیں، سعادت کی بہو منڈیر پر لونڈے کو لٹکائے اجابت کرا رہی تھی۔

"خدا کی قدرت!" لونڈا موری میں گرتے گرتے بچا

پھر یہ بات آگ کی طرح ساری چال میں گھوم گئی۔

"ایسا ہی ہوتا ہے"، لکشمی گھاٹے نے کہا۔ وہ ریڈی میڈ کپڑوں میں کاج بٹن بناتی تھی، اور بڑی جہاں دیدہ تھی، اس کا میاں لاپتہ تھا، ایک لڑکی تھی۔ وہ اس نے مشن اسکول میں دے دی تھی، سب اسے گالیاں دیتے تھے کہ اس نے لونڈیا کو عیسائی بنوا دیا ہے، لیکن لکشمی ایک کان سنتی تھی دوسرے کان اڑا دیتی تھی۔ کاج بٹن سے کہیں پیٹ پلتے ہیں؟ سب جانتے تھے، وہ راتوں کو جایا کرتی ہے، لالہ کے ڈر سے گاہکوں کو چال پر نہیں لاتی، مگر کسی کو کیا؟ اس نے داروں کے کبھی لفڑا نہیں کیا جیسے آئے دن انیٹری کیا کرتی تھی۔ نام اس کا ایڈ تھا مگر انیٹری ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ کھلے بندوں دارو کا دھندہ کرتی تھی۔ لالہ کو ڈٹ بخشش دیتی تھی۔ پولیس سے بھی ہفتہ مقرر تھا، کوئی اس کے منہ نہیں لگتا تھا، کیونکہ وہ آئے دن دارو چڑھا کر انگریزی میں گالیاں بکا کرتی تھی کم سے کم چال والوں کا تو یہی خیال تھا۔ کئی بار بھنور میں آچکی تھی، اور مسز لابین کی شکر گذار تھی کہ انہوں نے اس کی نیا پار لگائی تھی، چال میں کئی آبرو باختہ عورتیں رہتی تھیں، مگر کسی کو طعنے دینے اور اعتراض کرنے کی فرصت نہ تھی، ہر ایک کی کوئی نہ کوئی رگ دبتی تھی۔

"تو بیاہ کیا چال میں ہی رچے گا؟"

"اور کیا؟ سامنے کے میدان میں تمبو تن جائے گا۔ بمبئی میں تو بڑی بڑی شادیاں تمبو تان کے کی جاتی ہیں۔" شیو نے فیصلہ کیا۔

"ہائے مزہ آوے گا۔ اپنی سرلا بہن دلہن بنے گی۔" رام دلی کو شادیوں کا بڑا شوق تھا۔ وہ ہر موسم میں نئی شادی رچاتی تھی۔ کچھ دن بعد دولہا اسکی ٹھکائی کر کے کبھی کبھی کپڑے لتے تک چرا کے بھاگ جاتا۔ ابھی پچھلی شادی تو اس نے باقاعدہ کی تھی۔ تمبو تاننے میں بہت خرچہ آتا اس لیے بس کھولی ہی میں پنڈت لوہے کی انگیٹھی جیسا ہون لے کر آگیا۔ اور پھیرے ڈال دیئے۔ رام دلی خوب سج کر دلہن بنی۔ چالی پر عجیب عروسانہ موڈ چھا گیا۔ خوب بسی مہندی گھول کر سب نے تھوپی۔ ٹین بجا کر فلمی گانے گائے گئے۔ رخصتی کے وقت جو ہاتھ لگ گیا رام دلی اس سے گلے لگ لگ روئی۔ "ہائے میرا بیرن ــــ ہائے میرا بابل، ہائے مجھے مت اپنی ڈیوڑھی سے نکالو۔" وہ کسی فلمی سین کی یاد میں چنگھاڑتی رہی۔ پنواڑی نے تیز تیز آواز میں گراموفون لگا دیا۔ "کاہے کو بیاہی بدیس۔" گو نہایت سرٹ چنچناتی آواز میں بے حد سری عورتیں گا رہی تھیں۔ مگر یہ کمبخت گیت ہی کچھ ایسا ہے کہ جی بھر آتا ہے بیٹی کی رخصتی کا سماں بھی عجیب ہوتا ہے، حالانکہ رام دلی رخصت نہیں ہوئی۔ اس کا بھینگا دولہا بھی بیاہ کر چال ہی میں آگیا۔

کئی دن رام دلی شرمائی لجائی پایل بجاتی پھرتی رہی پھر دولہا نے اس کی

پٹائی شروع کر دی، روز دارو پی کر ہڈیاں توڑتا۔ مہینے بھر کے اندر اندر وہ اس کے چاندی کے کڑے اور ناک کی لونگ لے کر بھاگ گیا۔ رام دئی تھوڑا اسجلے کئی دن تک لنگڑاتی رہی اور اس کی بیان کو کوستی رہی۔

ان تلخ تجربوں کے باوجود لفظ شادی سے رام دئی کے دل میں لڈو پھوٹنے لگتے۔ اپنے علاوہ بھی کسی کی شادی ہو تو مضائقہ نہیں، موقع خوشی کا ہے۔

ڈرتے ڈرتے سرلا بہن کو پھیرا گیا۔ اور جب وہ ذرا جھینپ گئیں تو بس دھر لیا گیا۔

"سرلا بہن بیاہ کر ڈالو —"

"ہاں جی یہی عمر ہے کھیلنے کھانے کی۔"

"تمہارے ماتا پتا کی آتما کو بھی شانتی ملے گی۔"

"ہائے رام ہم تو خوب پلچل جائیں گے۔"

"چوک میں تنبو تنے گا۔"

"دولہا گھوڑے پر چڑھ کر آوے گا۔"

"سرلا بہن گھونگٹ کاڑھو گی؟"

"اے بھلا کیوں نہ کاڑھیں گی۔ کہیں بنا گھونگھٹ دلہن بنی ہے۔" رام دئی نے رائے دی، وہ اس لائن میں ایکسپرٹ مانی جاتی تھی۔

"ہائے چال سونی ہو جائے گی۔"

"سعادت کی بہو کا بچہ کون جنائے گا؟ ہر سال سعادت کی بہو کو سرلا بین کی خدمات کی ضرورت پڑتی تھی۔

"سوت نہ کپاس کوھو سے لٹھم لٹھا" سرلا بین چڑ گئیں "کس نے کہہ دیا تم سے شادی بیاہ کا؟"

"اے ہے تو پھر روز سیٹ بس میں کیوں دیتے ہیں؟" شبو تنتنائی۔

"یہ تو ان کی فضل منساہت ہے۔" سرلا بین نرمی سے مسکرائیں۔

"اے، تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو، آج سیٹ دیتے ہیں، کل بھی دیں گے۔" سعادت کی بہو نے گودی سے لونڈے کو لوٹے پر ٹھسک کر فیصلہ کیا۔ اس پر سب چمک اٹھیں۔

ان پیاری پیاری باتوں سے سرلا بین کی آنکھوں میں بھی خواب جھوم اٹھے۔ انہیں ان مدقوق، آبرو باختہ خرافہ عورتوں پر پیار آگیا۔ دل شکر گذاری کے احساس سے لبریز ہو گیا۔

"اب کی بار دودھ کم اترنے کی شکایت نہیں —— وہ بات بدلنے کو ایکدم نرس بن گئیں۔

"ابھی تک تو نہیں۔" سعادت کی بہو منمنائی ——"

"اور دیکھ ایڈ یتھ، اب کہ جو کچھ لفڑا ہوا تو قسم سے پولیس میں دیدوں گی۔ لوپ کیوں نہیں لگوا لیتی۔"

"بابا وہ لوگ ہسبینڈ کا نام پوچھتے" ایڈیتھ بھنائی۔

"اینڈری حد یک بالو کا نام دے دے —" رام دئی نے مشورہ دیا۔

"بٹ، ہم کیتھولک ہے وہ لُچّا......"

"تو سر ماجی کا نام دے دے۔"

"چپ رہو چڑیلو —" سرلا بہن نے سب کو ڈانٹا، اور سعادت کی گود لے لونڈے کو چپ کرانے کیلئے چچہ بھر سیرپ اسے چٹا دیا۔ "دور ہو یہاں سے"

"پہلے یہ بتاؤ شادی کب ہوگی" شبو اڑ گئی۔

"ہاں تاریخ مقرر ہو جائے" لکشمی نے مطالبہ کیا۔

"کس کی شادی؟ کیسی تاریخ؟ کوئی بات نہ چیت۔" سرلا بہن بگڑ گئیں۔

"بات نہ چیت، یہ کیسے؟ کیا دولہا گونگا ہے؟" قہقہہ پڑا

اور پھر سب نے بوکھلائی ہوئی سرلا بہن کو سمجھایا کہ ان کی ڈھیل ہی سے یہ بڑا ہوا ہے کہ ان جیسی گنونتی کنواری بیٹھی ہے۔ مرد کی ذات تو اٹھلوا ہوتی ہے، جب تک منہ میں نوالہ نہ ٹھونسو بات نہیں بنتی۔ سب سرلا بہن کے بہی خواہ ہیں، دشمن نہیں کہو تو اپنی جانیں بھی تمہارے لئے دے دیں۔ یہ چڑیا اب ہاتھ سے نہیں جانی چاہیئے۔"

کہو تو ان سے بات کرنے کو بولوں — سعادت کی بہو نے پوچھا۔

"ارے ہم خود بات کرنے کو تیار ہیں ان سے کہہ بابا لڑکی پسند ہے تو الیا

بات کرو۔" مگر رام دلی کی اس رائے سے سب کو اختلاف پیدا ہو گیا اسے مردوں کو پہچاننے میں ملکہ حاصل ہے، مگر کمبخت کو شادی کا چسکا پڑ چکا ہے، اگر امانت میں خیانت کی گئی تو؟ —— نہ بابا رام دلی سے اللہ بچائے۔

شاید بیچاروں کی ہمت نہیں پڑتی، یہ رعب داب کے کپڑے پہنے چشمہ چڑھا کے جاتی ہیں۔ وہ سوچتے ہوں گے میٹھی نظر سے دیکھا اور جوتے پڑے۔" شبو نے تشخیص کی۔

"کپڑے لتے کا اثر تو پڑتا ہے۔"

"ڈیوٹی کی اور بات ہوئی، پر یہ ہر گھڑی ڈاکٹرنی بنی رہتی ہیں ——"

"عورت کو کچھ سنگار تو کرنا ہی پڑتا ہے، ارے یہ نکھرا اس پر میک اپ ہو تو قسم سے نثری مان کے چھکے چھوٹ جائیں۔

"اور کپڑے بھی بھڑک دار ہوں۔"

"تھوڑا بہت تیل پھلیل۔"

"ہاتھوں میں چوڑیاں۔"

"کانوں میں آویزے —— پھر دیکھتے ہیں بابو جی کہاں جاتے ہیں۔"

سرلا بہن نے اس وقت تو سب کو جھڑک دیا، مگر سوچ میں پڑ گئیں، یہ دنیا کا دستور ہے، ممبئی میں ایک بھڑک دار عورت گھومتی ہے، سونی سادی عورتوں پر نظر ہی نہیں ٹکتی —— جیسا موقع ویسا بھیس۔

مگر اس کے پاس تو سادی کنی کی ساڑیاں تھیں دو چار بدرنگ سی کھٹاؤ کی ہوں گی گلے میں تار سی زنجیر تو پڑی ہی رہتی ہے ـــــــ اگرچہ اسے زیور کہنا زیادتی ہے۔ ماں کی یادگار ہے۔

رات کے سناٹے میں ان کے دماغ میں رنگ برنگے کپڑے اور زیور تھرکتے رہے۔

"شاید بیاہتا ہے۔" دوسرے دن شلو نے فکرمند ہو کر کہا۔

"نہیں بیاہے تو نہیں۔"

"کیسے معلوم؟"

"بس میں کوئی دوست ملے تو پوچھ رہے تھے، کمرہ ملا۔ وہ بولے ہاں ملا، کہنے لگے، اب شادی کر ڈالو۔"

"پھر کیا بولے، رام دلی قریب کھسک کر بولی۔

"ہنسنے لگے۔"

"چلو ادھر سے تو اطمینان ہوا۔ ذات کے تو ٹھیک ہیں؟"

"ہاں، بیگ پر رام سروپ بھٹناگر لکھا ہے۔ وہ تو پہلے ہی دن دیکھ لیا تھا۔"

"بس پھر کیا بات رہ گئی ہے جو ٹال مٹول کر رہی ہو؟"

"منہ سے جو نہیں بولتے۔"

"کچھ میٹھی نظروں سے کہتے ہوں گے؟"

"نہیں ـــــــ" جو کہتے بھی ہوں گے تو ـــــ سرلا بہن کے کاہے کو پلّے پڑے گا۔

رام دئی ہوتی، ایڈتھ ہوتی، شبو ہی ہوتی تو فٹ سمجھ جاتی دو دن میں بابو جی مٹھی میں ہوتے۔

"ٹھنڈی سانس بھری!"

"نہیں ——— !"

"تو یہ بلا مردوا کون سی مٹی کا بنا ہے ———" سعادت کی بہو بگڑ گئیں۔

بڑی کائیں کائیں کے بعد طے ہوا کہ سر لابین دور اندیشی پر تیار ہوں، تیر تفنگ سے لیس ہو کر منہ میں ڈال دیں، تب ہی نیا پار لگے گی۔

بس اسی کارن عورتیں اپنے اپنے ترکشوں سے سامان نکال نکال کر سر لا دیوی کی کمک کو پہنچنے لگیں۔ شبانہ کبھی فلموں میں ایکسٹرا کا کام بھی لے لیتی تھی، وہ وہاں سے نہ جانے کیا الم غلم لایا کرتی تھی، ہیئر لپسٹک اسٹو تو سعادت کی بہو کے پاس بھی سال بھر پڑی تھی۔ ایڈتھ کے پاس تو تمام اسمگل کیا ہوا کاسمیٹک تھا وہ ایک ہیئر ڈریسر کو بھی جانتی تھی، اور خود بھی فٹ کلاس غبارے نما اونچے تو بنی جیسے بال بنا لیتی تھی۔ اس کے پاس ایسے ایسے چھوٹے بڑے کپڑے تھے جو اگر کبھی کو پہنا دو تو بت کافر بن جائے۔

بس سب کی سب مرمت پر جُٹ گئیں سر لابین نے بہت نانا کی مگر شبو نے اپنی پیازی نائیلون جارجٹ کی ساڑی، جس پر سیکوئنس کا کام بنا تھا، انہیں پہنائی بلاؤز پر بہت جھگڑا پڑا شبو کہتی تھی، تازہ ترین فیشن کے مطابق سرخ بلاوز اور سرخ بیٹی

کوٹ ہونا چاہیئے، نیچے سے چلکا مارے گا اور لال ہی سینڈل ہوں، تب آئیگا مزہ۔
مسز لابین بگوڑی کو نہ فٹنگ کا پتہ نہ میچنگ کے راز معلوم۔ ان کے ہاتھوں میں
کھیل نبتی رہیں۔

مونہہ پر پہلے کریمیں تھوپی گئیں، مع سعادت کی بہو کی ہیزلین اسنو کے، جو
سوکھ چکی تھی، کیونکہ وہ پرا مانے جا رہی تھی۔ پھر روز اور پاؤڈر کے پلستر چڑھے
خوب سا سیاہ سوت لے کر تو بنی کی شکل کا جوڑا بنا، پھر زیور کی باری آئی، اس
پر خانہ جنگی ہوتے ہوتے بچی، ہر شخص یہی چاہتا تھا کہ اس کا چندہ زیادہ سے
زیادہ ہو۔

جب اونچی ایڑی کے کارچوبی سینڈل پہن کر مسز لابین بس اسٹاپ پر لہراتی
ڈگمگاتی پہنچیں تو ان کے بغیر آنکھوں میں تو مرے سے ناچ رہے تھے۔ پسینے کے
شرارے چھوٹ رہے تھے۔

"کیا عورت ہونا کافی نہیں، ایک نوالے میں اتنا اچار چٹنی، مربہ کیوں
لازمی ہے؟" ان کی آنکھوں میں آنسو کھٹکنے لگے۔

اور پھر اس نوالے کو بچانے کیلئے ساری عمر کی گھس گھس۔

جب تھوڑی ہی دیر بعد لوگوں نے مسز لابین کو لشتم پشتم واپس لوٹتے دیکھا،
تو سب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ بغیر دولہا کے ڈگمگاتی لرزتی چلی آ رہی تھی۔
گالوں پہ کاجل کی لکیریں بہاتی۔ وہ گڑ میں گرتے گرتے بچیں۔

نوالہ تھوک دیا گیا!

یہ کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟ سر لا بنی سوالوں کی بوچھاڑ سے بے دم ہو کر پلنگ پر گر پڑیں۔

وہ جب بس میں داخل ہوئی تو وہ ان سے قطعی غافل اخبار پڑھتا رہا۔ وہ رکاب پکڑے سیٹ کے پاس کھڑی جھولتی رہیں اور وہ بس کے دروازے کی طرف بار بار دیکھتا رہا۔ جیسے کسی کا منتظر ہو۔

انہوں نے نظروں کے سارے تیر اس کے کلیجہ میں جھونک دیئے۔ مگر وہ ان کی طرف سے منہ موڑے دروازے کو تکتا رہا۔

انہوں نے کانتا کی مہک میں بسا ہوا گلابی آنچل ڈھلکایا، مگر اس نے اخبار سے نظریں نہ اٹھائیں۔

انہوں نے ایک بھرپور انگڑائی لی۔ مگر اس کی آنکھوں میں مستیاں نہ لہرائیں۔ اس نے ایک پتھرائی ہوئی نظر ان پر ڈالی اور ان کے دھوم دھڑکے کو بے اعتنائی سے ٹھکراتا ہوا اخبار پر جھک گیا۔

سامنے کی سیٹ خالی ہو گئی، اور وہ اس پر ڈھے گئیں۔ سارے تیر سنسناتے ہوئے وار خالی دے گئے، اور خالی ترکش لرزتا رہا، کانپتا رہا۔

ڈرتے ڈرتے انہوں نے اپنی سیٹ سے مڑ کر دیکھا، وہ بس سے اتر کر جا رہا تھا۔ اترتے وقت اس نے بس اسٹینڈ پر دھندلاتے ہوئے ستو گرگٹ سے پوچھا،

"کیوں رہے پاجی آج سرلا دیوی نہیں آئیں؟"

ستّو گرہ کٹ ہکلاتا رہ گیا، اور اجنبی لمبے لمبے ڈگ بھرتا سامنے گلی میں گم ہو گیا۔

کیڈل کورٹ

کچے چھڑے کی مختصر سی گدی کچھ زنگیائی کیلیں اور نعل ایک آدھ ہتوڑی رانپی، سوا اور چند ملکبوترے، یہ ہے اس کا سارا اثاثہ۔ اس کے علاوہ چند پھٹے اودھڑے جوتے، ایک الجھی ہوئی گدڑی دو چار ٹین کے ڈبے یہ ہے اسکا گھر جبکا ٹھیک ڈاک کا پتہ ہے۔ کیڈل کورٹ کی موری سے ذرا بائیں طرف کو ایرانی ہوٹل کے سائبان کے نیچے جہاں اوپر سے پھینکے ہوئے کچرے اور پان کی پیکوں سے پوری طرح محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ اس کا مکان، گھر، محل، حویلی جو بھی سمجھ لیجیے، واقعہ ہے، یہی اس کا وطن ہے اور وہ یہیں کا باشندہ، نہ جانے کب سے رہتا ہے اور کب تک رہے اندازہ تو یہی کہتا ہے کہ صاحب لوگوں کے جوتوں پر پالش کرتے کرتے اسے اس نفع بخش پیشہ کو اختیار کرنے کا خیال آیا ہوگا اور یہ خیال جب تک آتا رہے گا۔ جب تک کہ ایک دن اسی جگہ مجبوراً اس کی روح اس کے کڑوے کسیلے جسم سے دق ہو کر بھاگ نکھڑی ہوگی۔ اور پھر جب وہ حسب معمول گودڑ میں سے جہاں وہ روز صبح کے ساتھ

ساتھ چھپ جاتا ہے۔ نکل کر پرانے جوتوں کی قطار لگا کر خام چمڑے کی گڈی نہ کھولے گا۔ تو وہ راہگیروں کی ٹھوکروں سے بھی نہ جاگے گا۔ تو نا کے پر کھڑا ہوا سپاہی اپنا فرض انجام دیتا رہے گا۔ سڑک پر موٹریں دوڑتی رہیں گی۔ ہوٹل میں پیالیاں کھنکتی رہیں گی۔ اور ساری جیتی جاگتی فضا میں وہ سویا پڑا رہے گا۔

پھر جب اس کی نیند کا بھرم کھلے گا تو کیڈل کورٹ کے باسی اور ہوٹل میں آنے جانے والے چہ میگوئیاں شروع کر دیں گے۔ کتے اس کے سرد جسم کو سونگھیں گے اور مکھیاں بھنبھنائیں گی۔ سرکاری لاری آئے گی اور بحیثیت ایک شہری کے اسے اس کا حق سونپ دے گی۔ نہ جانے وہ وقت کب آئے گا۔ فی الحال تو وہ ہوٹل کھلتے ہی جاگ پڑتا ہے، اینٹوں کا مضحکہ خیز دریچہ سا بنا کر اس پر او ولٹین کے خالی ڈبے میں پانی چڑھا دیتا ہے۔ ہوٹل کے پاس رہنے میں اسے کتنے ہی فائدے ہیں۔ علاوہ بزنس کی فراوانی کے عمدہ کھانوں کی لذیذ خوشبو مفت ہاتھ آتی ہے۔ اُبلی ہوئی چائے کی پتیوں کو پوری پوری روزانہ حفاظت سے اگر سکھا لیا جائے تو بافراط چائے تیار کی جاسکتی ہے۔ گو یہ پتیاں ابالنے کے بعد خوب مسلنے پر ذرا سا ہی رنگ چھوڑتی ہیں۔ کیونکہ ہوٹل والا خود ان کا پہلے ہی کئی کئی بار خون نچوڑ لیتا ہے۔ تب پھینکتا ہے۔ گرم گرم میلا پانی پی کر وہ اطمینان سے اپنی دوکان کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے۔ شاید فورٹ کی دو کانوں کے بڑے بڑے مالک بھی اتنا وقت سجانے میں نہیں صرف کرتے ہوں گے۔ وہ بڑی احتیاط سے کچے چمڑے کی گڈی کھولتا ہے۔ ایک ایک ٹکڑے کو جانچتا پرکھتا ہے۔ پتہ نہیں وہ اپنی

چندھی آنکھوں سے ان ٹکڑوں پر کیا گھورا کرتا ہے۔ پھر سر ہلا کر انہیں درجہ بدرجہ ترتیب دیتا جاتا ہے۔ پھر وہ زنگ کھائی کیلوں کی ڈبیاں اور شیشیاں نکال کر دواؤں کی طرح سجاتا ہے۔ نعل اور چمکیلی کیلیں بڑے حساب سے بچھاتا ہے۔ پھر پرانے جوتوں کی قطار لگانا شروع کر دیتا ہے۔ اس سجاوٹ میں وہ برابر ردوبدل کئے جاتا ہے۔ حتیٰ کہ کوئی گاہک اسے آکر چونکا نہ دے ایسی صورت پیدا ہوتے ہی وہ نہایت پھرتی سے جوتے کی نبض دیکھ کر نسخہ تجویز کر دیتا ہے۔ پھر مزے لے کر ایک ماہر فن جراح کی طرح وہ اس کا ایک ایک جوڑ ٹھونک بجا کر دیکھ لیتا ہے، جیسے اسے عشق ہو ان جوتوں سے۔ ہاتھ میں لیتے ہی پہلے تو وہ بڑے پیار سے اسے الٹتا پلٹتا ہے، پھر گاہک کی طرف دیکھتا ہے، گویا پوچھتا ہے۔ اب لائے ہو بیچارے کو۔ اب اس میں جان کہاں۔ خیر دیکھتا ہوں۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ اور پھر اوزار چل پڑتے ہیں، جھٹاپٹ سُوا چمڑے میں ڈبکیاں مارتا ہے، زنگ کھائی کیلیں اپنی اپنی جگہ ڈھونڈ کر گھس جاتی ہیں۔ اور تھوڑی کھٹا کھٹ معاملہ فٹ کر دیتی ہے، گاہک چُرمُر کرتا مسکراتا چل دیتا ہے اور وہ پھر جوتوں کی قطار نئے سرے سے جاذب نظر انداز میں جمانے لگتا ہے۔

کیپٹل کورٹ کی موری کے دائیں جانب ایک گیرج ہے، جس میں کسی زمانے میں موٹر رہا کرتی تھی، پر اب وہ موٹر تو سڑک کے کنارے کھڑی رہتی ہے اور اس کی جگہ پندرہ آدمیوں نے چھین لی ہے۔ بیس فٹ مربع جگہ میں پندرہ جی نہ جانے کس آسن سے اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔ یہ کسی نے آج تک نہیں دیکھا۔ کیونکہ

گیرج کا دروازہ اوپر سے ہمیشہ نیچے کھنچا رہتا ہے۔ صرف جُھک کر جانے کا انتظام

ہے۔ اگر آپ کو شوق ہو تو کیڈل کورٹ کے سامنے فٹ پاتھ پر اکڑوں بیٹھ جائیے تو آپ کو گیرج کے اندر بہت سے میلے پیر، کھلے گھٹنے اور برہنہ کندھے آپس میں گتھم گتھا نظر آئیں گے۔ یہ اعضاءِ جسم عورتوں کے بھی ہیں اور مردوں کے بھی، ماؤں کے بھی اور بہنوں کے بھی، بہوؤں کے بھی اور بیٹیوں کے بھی پتہ نہیں وہاں کیا بکتا ہے اور کیا کھایا جاتا ہے۔ اہکے ہوئے انسان کی بو ہمیشہ مہکے دیا کرتی ہے۔

اور وہ موٹر جو کچھ دن پہلے گیرج میں شان سے رہا کرتی ہے۔ وہ سڑک کے کنارے منہ بسورا کرتی ہے، روز صبح باپ بھائی یا بیٹا گیرج کے ادھ کھلے پھاٹک میں سے گردن نہوڑا کر نکلتا ہے اور موچی سے ذرا فاصلہ پر اپنے ذریعۂ آمد کو چمکا دمکا کر آئینہ بنا لیتا ہے۔ رات کے چھوڑے ہوئے باسی پھول جھوٹے پتے اور ٹوٹے گلاس موری میں جھاڑ دیتا ہے اور اپنا کاسۂ گدائی لے کر روانہ ہو جاتا ہے۔

گیرج اور ہوٹل کے بیچ میں ایک پھاٹک ہے، یہ کیڈل کورٹ کا پھاٹک ہے۔ جس کے کھمبے پر مالک کا نام اور عمارت کا نام اور سال تعمیر کندہ ہے۔ یہ عمارت کیڈل کورٹ ہے۔ کورٹ کے معنی ہیں کچہری، جہاں مقدمہ اور چالان وغیرہ ہوتے ہیں۔ مگر یہاں ایسی کوئی حماقت نہیں، ہاں یہ اور بات ہے کہ نچلے مالے پر رہنے والے فلم اسٹار سے حکومت کو خاص قسم کی پرکاش ہو گئی ہے اس فلم اسٹار کو آپ نہیں پہچانتے چونکہ اس نے کبھی کسی فلم میں کام نہیں کیا۔ پھر بھی فلم اسٹار ہے کیونکہ اسے امید ہے کہ ایک نہ ایک دن ضرور فلمی دنیا کو اپنی حماقت پر رحم آئے گا اور وہ کسی فلم میں جلوہ

افروز ہو کر رہے گا۔

اسکا ذریعہ آمدنی امید واری ہے۔ وہ اسی امید پر جیتا ہے۔ ویسے اسے کسی نے کبھی بغیر گاڑی کے کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا، وہ ہمیشہ مرغ زریں کی طرح تمتماہٹ کا چھچہ موڑے ایک سے ایک عمدہ کار سے اترتا چڑھتا دیکھا جاتا ہے۔ کتنی ہی فلمی پریاں اسے ہیرو بنا چکی ہیں۔ جس فلم کمپنی میں جاتا ہے۔ وہاں کی فلم ہیروئن کو لے اڑتا ہے۔ تنومند ہے، خوبرو ہے اس کی پیشانی سے بے رحمی ٹپکتی ہے۔ پر منہ کنواریوں الیسا ہے، وہ نیلے پیلے اور سبز چنگھاڑتے ہوئے رنگوں کے کپڑے پہنتا ہے۔ اور بالوں میں مصنوعی خم بنواتا ہے، اور جب فلمی پریاں اس کے لیے کالے بازار سے وسکی کی بوتلیں لاتی ہیں تو انہیں خالی کر کے وہ ان کے سروں پر پھوڑتا ہے۔ اور جب وہ حاملہ ہو جاتی ہیں تو بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ باوجودیکہ وہ اسقدر جلاد قسم کا مرکھنا دیو ہے۔ پھر بھی اس کے گرد ہمیشہ پریاں بھڑ بھڑایا کرتی ہیں۔ شام پڑتے ہی اسکے یہاں گرد و نواح کے رنگین مزاج جمع ہو جاتے ہیں۔ آئے دن ناچ و رنگ کے جلسے رہتے ہیں کبھی کبھی وہ بڑے مقدس انداز میں ان پریوں سے شادی رچا لیتا ہے، پھر کچھ دن کے لیے کیڈل کورٹ کی نچلی منزل میں موت سی ہو جاتی ہے، سارے قہقہے، چہچہے ایک اجاڑ قسم کی خاموشی میں ڈوب جاتے ہیں۔

پھر اس کے بالوں کے خم ختم ہونے لگتے ہیں۔ سوٹ ماند پڑھ جاتے ہیں اور نچلی منزل میں چھوٹے چھوٹے زلزلے آنے لگتے ہیں کیونکہ فوراً ہی کسی فلمی ہیروئن کو شدت سے

ایک ہیرو کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اور وہ دوبارہ بالوں میں خم ڈلوا کر تلاش معاش میں جٹ جاتا ہے۔ اور پھر خالی بوتلیں سروں پر پھوٹتی ہیں، کیڈل کورٹ کے نوابوں کی نیندیں اچٹتی ہیں۔ اور ایک بند ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کی بیوی بچا کھچا مال سمیٹ کر نو دو گیارہ ہو جاتی ہے۔ اور اس کے بعد پھر وہی چہچہے شروع ہو جاتے ہیں اور اس طرح یہ زندگی کی پوجی چلتی رہے گی یہاں تک کہ ایک دن وہ سچ مچ ہیرو پردہ سیمیں پر جلوہ افروز ہو جائے گا، یا اسی امید میں اس کے گھنیرے بال عمر کی اندھیری وادیوں میں منتشر ہو جائیں گے۔ اس کی کھنچی ہوئی بھنویں جھک جائیں گی اور چمکیلی آنکھیں گدلا جائیں گی۔ اسکے تنے ہوئے پٹھے جھول کھا جائیں گے، چیتے جیسی کمر پھیل کر بھکنا بن جائیگی۔ اور پھر نہ ہی پریاں اس کے گرد منڈلائیں گی اور نہ پھر دل پر خالی وسکی کی بوتلیں پھوڑائیں گی پھر وہ لٹی کھٹی طوائف کی طرح ...... نہ جانے کیا کرے گا۔ زندگی اسے پھٹی جوتی کی طرح گھسیٹتے گھسیٹتے ایکدم چھوڑ کر چل دے گی۔ اور پھر؟ پھر نہ جانے کیا ہوگا۔ اس کا گھر کوئی دوسرا امیدوار لے لیگا۔ اور امید کی شمع جلا کر دوکان سجالے گا۔

دو زینے طے کرنے کے بعد کیڈل کورٹ کا پہلا مالا ہے، یہاں ایک مرہٹی جوڑا رہتا ہے، چھوٹا سا خاندان، نوجوان میاں اور کمسن بیوی۔ اور ننھا منا سا ایک بیٹا اور ایک بوڑھی لڑکا کا ماں، نوجوان کہیں پورٹ کی کلرکی کرتا ہے۔ اور کمسن بیوی کسی لوکل اسکول میں معلمہ ہے، دونوں کی مجموعی کمائی ایک سو دس روپیہ ہے، نوجوان گریجویٹ ہے۔

اور اس کی بیوی میٹرک پاس ہے۔ اور یہ دونوں مل کر ایک سو دس روپیہ ماہوار کما لیتے ہیں۔ بیالیس روپیہ مکان کا کرایہ باقی اڑسٹھ روپے میں کالے بازار سے گیلے کوئلے اور کرکری شکر کے علاوہ چار جانوں کا کھانا پینا، سیر تفریح سب کچھ ہو جاتی ہے۔

جب ہندوستان آزاد نہ تھا، تب بھی یہ خاندان یہیں تھا، جب یہاں ایک باپ بھی تھا، یہ گھر ہمیشہ لیڈروں کی تصاویر سے آراستہ پیراستہ رہا، اور جب ہندوستان آزاد ہو گیا تو سب سے زیادہ روشنی اور جھنڈیاں انہیں کی بالکنی میں لگی تھیں، گھر کے دروازے پر، سیڑھیوں پر اور تصویر کے چوکھٹے میں فریم کیا ہوا جے ہند نہایت روشن اور منور ہے۔ کمرے کی سب سے بڑی دیوار پر سوبھاش بابو کی سلیوٹ کرتی تصویر ہے۔ اس کے اوپر کچے سوت کے ہار پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ گئے سال کا ذکر ہے۔ اس سال ۱۵ اگست کو ان کی بالکنی میں جھنڈوں کی تعداد سکڑ گئی تھی، اور دیئے دو چار ہی گھنٹے ہی ٹمٹما کر رہ گئے اور دیوار پر لکھا ہوا جے ہند ماند پڑتا جا رہا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس اگست کو جب آزادی آئی تو گورنمنٹ نے کنٹرول نہیں کیا۔ اس لیے ساری آزادی بلیک مارکٹ میں دھر لی گئی، جس کا جی چاہے آزادی لے آئے پر ذرا مشکل سے ملتی ہے، کیونکہ وہی بات ہے کہ مانگ زیادہ ہے، اور سپلائی کم، آزادی تو کوئی ایسی دیسی چیز تو تھی نہیں کہ دھوپ اور ہوا کی طرح ہر ایک ایرے غیرے نتھو خیرے کو بانٹ دی جاتی نہایت احتیاط سے سلینت کر رکھی گئی ہے۔ بوقت ضرورت بانٹ دی جائے گی۔

اور ایسی بٹوارے کی آس لگائے یہ جوڑا زندگی کا قرض اتارتا چلا جا رہا ہے، یوں

ہی جے ہند اور قومی لیڈروں کے سائے میں کمر جھکائے ایک سو دس روپے میں گھر کی آگ سلگتی رہے گی یوں ہی نوجوان یہاں سے فورٹ اور فورٹ سے گھر آواگون میں جتا رہیگا اور کمسن بیوی دوپہر کے وقفے میں ننھے کو دودھ پلانے ہانپتی دوڑتی آتی رہے گی۔

پھر ایکدن یہ نوجوان اپنی جگہ بیٹے کو سونپ کر چل دے گا۔ اور وہ ننھا جوان ہو کر اور بھی بڑے بڑے لیڈروں کی تصویروں سے کمرے کو سجائے گا۔ اور سیڑھیوں پر لکھا ہوا جے ہند، نئے رنگ سے جگمگا اٹھے گا، پھر ایک سو دس روپے آئیں گے اور گیلے کوئلوں اور کرکری شکر کے بھینٹ چڑھ جائیں گے۔

دو زینے اور بڑھیے یعنی زمین سے چار زینوں کی اونچائی پر ایک نہایت اعلیٰ خاندان کی اصلی جیتی جاگتی فلم اسٹار سکونت پذیر ہے، وہ میری سہیلی ہے۔ یہ میل جول اس زمانے کی یادگار ہے جب میں نے بمبئی سے پورے طور سے قدم نہ ڈالے تھے اور ہر فلم اسٹار کو جیتا جاگتا دیکھکر چیخیں نکل جاتی تھیں۔ عرصہ سے ہم ایکدوسرے کی خوشی اور غم میں شرکت کرتے آئے ہیں، اپنی خوشی نہ سہی کم از کم مجھے تو اس کے سارے غموں میں شرکت کرنا ہی پڑتا ہے۔ ویسے وہ دیکھنے میں اچھی خاصی انسان معلوم ہوتی ہے مگر ایک نہایت ہی مکروہ لت اس کو چمٹ گئی ہے۔ وہ ہے عشقبازی وہ تعلیم یافتہ مہذب ہے، لہٰذا اسکے عشاق میں عموماً شعرا ادیب اور جرنلسٹ بھی پائے جاتے ہیں۔ میری سہیلی کا کہنا ہے پتہ نہیں کہاں تک درست ہے کہ وہ سب کے سب اس کے عشق میں گرفتار

ہیں یا کبھی گرفتار تھے یا گرفتار ہونے کے آرزومند ہیں۔ پتہ نہیں اسے یہ شبہ کیوں ہو گیا ہے کہ میں عشق کے معاملے میں ایکسپرٹ ہوں کیونکہ وہ ہمیشہ تازہ واردات کے موقع پر مجھی سے رائے لیتی ہے۔ جہاں اس کے تازہ عاشق سے چشمک چلی جو کہ ضرور چلتی ہے، چونکہ وہ عشق صرف لڑنے روٹھنے اور منانے کیلئے کرتی ہے تو میرا دم سوکھ جاتا ہے آئے دن میری جان پر مقدمے دائر ہونے لگتے ہیں۔ اور تو اور اسے عشق کے جملہ مراحل طے کرنے کیلئے میرا ہی گھر موزوں نظر آتا ہے۔ میرے ہی صوفوں پر روٹھتے مناتے ہیں، میرے ہی گلدانوں سے ایک دوسرے کے سر پھوڑتے ہیں۔ اور بعض ہی زمانے میں تو مجھے خود اپنے گھر میں باقاعدہ کھنکار کر ہوک بجا کر جانا پڑتا ہے۔ کتنی بار جی چاہا کہہ دوں تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے، تمہارے یہ دکھڑے سننے کیلئے میرے پاس وقت نہیں۔ کیا میں ایسی بے مصرف ہوں کہ سوائے تم جیسی ناکارہ چیز کے اور کوئی اُلجھن میری زندگی میں نہیں میں بیٹھ کر تمہارے عاشقوں کے دکھڑے سنوں یا سوچوں کہ اناج کتنا کم ملتا ہے۔ راشن پر چاول تو جیسے بونے سے پہلے بیج پڑ گیا تھا۔ جب سے کنٹرول کھسکا ہے، آنکھیں لٹھے ململ کو ترس گئی ہیں کہتے ہیں کفن کا کوٹہ ملتا ہے۔ کاش مرنے سے پہلے وہ کفن والا لٹھا مل جائے تو ایک غرارہ مزے سے بن جائے۔ پھر شکر میں کتنی دھول ہوتی ہے، جانو گنے ہی کر کرے بوئے جانے لگے پر تم کیا جانو ان باتوں کو۔ یہ جو عاشقوں کا چھکا ملیٹھے بٹھائے جان کو لگا رکھی ہو کہ سال کے بارہ مہینے بس ان ہی کی جان کا رونا کہ اب کونسی فصل آئی۔ کون سے کاٹے جائیں اور کون سے تازہ بوئے جائیں

کون گی ادھیڑ بن کی جائے۔ اور کون سے جھاڑ پونچھ کر تھیلین کی گولیاں ڈال کر اسٹور کر دیئے جائیں کہ بوقت ضرورت کام آسکیں۔

اور پھر میرا جی بول اٹھتا ہے۔ اور موچی کی خام چمڑے اور پرانے جوتوں والی دکان آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ مجھے اس کے عاشق جوتوں کی ایک طویل قطار کی معلوم ہوتے ہیں۔ اونچی ایڑی کے، نیچی ایڑی کے، بغیر ایڑی کے ولایتی، ہندوستانی سلیپر اور واکنگ شو، ڈانسنگ شو اور پلیٹ فارم شو۔ روپہلے چمکیلے اور پھٹے ہوئے چپٹے اور گھٹیلے پر کوئی بھی تو ان میں سے فٹ نہیں کسی کا پنجہ کاٹتا ہے تو کوئی ایڑی پر چھالا ڈالتا ہے۔ کسی کا تسمہ ڈھیلا تو کسی کا بکسوا تنگ۔ کوئی بھی تو ایسا نہیں کہ مزے سے پیر میں ڈال کر زندگی کی پگڈنڈی پر ٹھمکتی پھلکتی چلی جاؤں۔

ان کے تازہ ترین عاشق سے میرا پالا پڑ رہا ہے۔ وہ ایک عرصہ سے مجھ سے ایک فلمی کہانی لکھوانا چاہتا ہے اور اتنے بھاؤ تاؤ کر رہا ہے کہ کوئی دم میں کمر ٹوٹا چاہتی ہے۔ اور وہ بھی سمجھ گیا ہے کہ کچھ دن بعد میں اس کی مرضی کے مطابق داموں پر لکھنے پر مجبور ہو جاؤں گی۔ پھر اس میں وہ جملہ رد و بدل کر کے اپنی بوڑھی داشتہ کو میرے تخیل کی پندرہ سالہ چھوکری بنا دے گا۔ اور تھل تھل کرتے دنبے جیسے ہیرو کو جو حاملہ عورت کی طرح پھیل پھیل کر چلتا ہے، اور جس کے سینے پر اتنا گوشت ہے کہ بآسانی بتیس نمبر کی برے زیر پہن سکتا ہے جواں سال ہیرو کا پارٹ دیدیگا۔ پھر جب یہ بوڑھی گھوڑی اور ڈھیلا ہاتھی پھدک پھدک کر باغوں میں دوگانے گائیں گے۔ میرا سر شرم

سے نیچا ہو جائیگا۔ میں کسی کو نہ بتاؤں گی کہ یہ کہانی میں نے تخلیق کی تھی۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ وہ کہانی مہنگے کوئلوں بھیگی شکر اور کمیاب لٹھے نے اس کو بتائی تھی۔ کالے بازار سے لٹھا اور ململ خریدوں گی۔ اور بھیگے کوئلے کہ اس کی آنچ سلگتی رہے۔ اور پھر مجھے کہانی لکھنے کا معاوضہ ملے۔ یہ ایک عجیب وغریب چکر ہے جس میں میں، فلم ڈائرکٹر اور کالا بازار ایک دوسرے کی دم پکڑے چک پھیریاں لے رہے ہیں۔ میں فلم ڈائریکٹر کو اور فلم ڈائرکٹر کالے بازار کو اور کالا بازار مجھے مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔ اس چکر میں مجھے کتنی متلیاں آئی ہیں! ـــــ خالی متلیاں، پھل ندارد! اور یہ متلیاں یوں ہی آتی رہیں گی۔ یہاں تک کہ فلم اسٹار کے چھدرے بال جھڑ جائیں۔ چہرہ ناقابلِ مرمت ہو جائیگا اور وہ اپنے عاشقوں میں سے کسی ایک کے حق میں قرعہ ڈال دے گی اور اس کے گھر میں بیٹھ کر موٹی نہ ہونے کی فکروں میں پڑی پھولا کرے گی اور ایک دن فلمی کہانی لکھتے لکھتے میں اپنا قلم چبا کر نگل جاؤں گی۔ اور ان گیلے کوئلوں کو اتنا پھونکوں گی کہ وہ بھڑک اٹھیں گے۔

اگر آپ کی ٹانگیں شل نہ ہو گئی ہوں تو دو زینے اور طے کر ڈالیے یہ کیڈل کورٹ کا تیسرا مالا ہے۔ اگر آپ دروازے پر دستک دیں تو ایک ابھاڑ صورت مریض دروازہ کھول کر جھانکے گا۔ اور سہم کر آپ سے درخواست کریگا۔ کہ بھائی غل کیوں مچاتے ہیں۔ خواہ غل، بالکل نہ مچ رہا ہو۔ یہ بیچارہ ایک مزدور پیشہ ہے۔ آدمی ہے۔ یہ جو آپ کو سمندر کے کنارے چاٹ پکوڑی کی دکانیں نظر آتی ہیں۔ یہ قریب قریب نصف اسی کی ہیں جنہیں اس نے ٹھیکہ

پر دے رکھا ہے، وہ نہایت ذلیل درجے کے ٹھگ ہیں اور بہت کم منافع لاتے ہیں۔
ویسے یہ اور بات ہے، کہ میرین لائن پر اس کی ایک قطار میں تین عمارتیں ہیں۔ باندرا
میں دو بنگلے ہیں۔ ایک تو غریب نے اپنے ذاتی مصرف کے لیے بنوایا تھا۔ تمام ایئر کنڈیشن
کرایا۔ مگر پھر شرنارتھیوں پر دیا کھا کر صرف پچیس ہزار پگڑی لے کر دے دیا۔ بیچارہ بلڈنگ
اپنے لیے بناتا ہے، لوگ لے لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے، کہ وہ خود اس بوسیدہ عمارت میں رہتا ہے۔
اب تو یہ حال ہے کہ مکان کی نیو پڑی اور پگڑیاں ٹپکیں۔ کرے بھی تو کیا؟ لوگ چھوڑتے ہی
نہیں۔ اب وہ دن دور نہیں کہ وہ اپنے موجودہ مکان کو دے کر خود فٹ پاتھ پر موچی کے
شانے سے شانہ ملا کر پڑ جائے گا۔ دنیا اسے سرمایہ دار سمجھتی ہے۔ حالانکہ اس کی روح
تک ننگی بچی ہے اس کا سارا روپیہ کاروبار میں پھنسا ہوا پھولتا جا رہا ہے۔

ان مکانوں کے علاوہ فٹ پاتھ پر کپڑے کی اس کی ہزاروں چھوٹی چھوٹی دکانیں ہیں،
یہاں وہ مل سے پورے تھان لا کر ان کے کٹ پیس بنا کر کالے بازار کے بھاؤ بیچتا ہے۔ یہ فٹ
پاتھ پر سارے بمبئی میں کالا بازار پڑا جگمگاتا ہے۔ مگر اسے نہ پولیس کا سپاہی دیکھتا ہے نہ ہمارے
دیس کے مقدس لیڈر جیسے وہ جادو کی ٹوپی پہنے ہو۔

دو زینے اور گھسیٹ ڈالیے۔ اپنی ٹانگوں کو ویسے دم تو نہ رہا ہو گا، یہ کیڈل کورٹ کی
چھت ہے۔ یہاں صرف ایک کوٹھری ہے جس میں مالک مکان کا فالتو کوڑا مثلاً پرانی ٹنکی ٹوٹی
ہوئی کھڑکیاں، موٹر کے گھسے ہوئے ٹائر، خاک دھول، جھینگر اور مکڑیوں کے درمیان ایک
میلی سی دری انسانی ہاتھوں سے بچھائی نظر آئے گی۔ ایک طرف کچھ نئے پرانے کاغذوں، رسالوں،

اخباروں کا ڈھیر، رسی پر میلے کپڑے، ایک کونے میں ایک انگیٹھی جس پر سیاہ المونیم کی کیتلی اور دو چار پڑیاں چائے گڑ شکر کی۔ ان چیزوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کوئی انسان کی قسم کی شے بھی بسیرا کرتی ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو اس پراسرار ہستی کے دیدار سے مستفید ہو چکے ہیں۔ رات کو آخری ٹرام کے رُک جانیکے بعد کیڈل کورٹ پر حیرت انگیز سناٹا چھا جاتا ہے۔ ایک پراسرار قدموں کی چاپ گونجنا شروع ہوتی ہے پتلی تھکن میں ڈوبی ہوئی چاپ جیسے ہزاروں قدم ایک لے سر میں غرق چل پھر رہے ہوں لہ پھر یہ چاپ کیڈل کورٹ کی طرف سرکنا شروع ہوتی ہے، اور پھاٹک میں داخل ہو کر ملبے اور تاریک زینوں پر رینگنے لگتی ہے، اسی وقفے سے اسی وزن سے قدم ایک ایک سیڑھی پر گرتے اٹھتے ہیں اور بغیر سستائے کیڈل کورٹ کی چھت پر پہنچ جاتے ہیں اگر کبھی رات کو ایک بجے کے بعد کیڈل کورٹ میں آنکھ کھل جائے تو آپ ان قدموں کو سنتے سنتے کانپ اٹھیں گے۔ جیسے کوئی روح عالم بالا کو چڑھ رہی ہو۔ ایک ایک چاپ گرتے لیجیے،

یہ ایک عجیب و غریب شے کی ملکیت ہے یہ میں اسے شے ہی کہوں گی۔ کیونکہ کیڈل کورٹ کے باسی نہ اس کا نام جانتے ہیں نہ مذہب۔ جن لوگوں نے اسے دیکھا انہیں بھی شک ہے کہ وہ پتہ نہیں زندہ ہے یا کسی مردے کا بھوت۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے۔ وہ کوئی پریشان روح ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں، سرکاری جاسوس ہے۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ فرار شدہ مجرم ہے۔ اور اس کے نام کا وارنٹ نکلا ہوا ہے۔ اور واقعہ بھی کچھ اس قسم کا ہے۔ ایک بار سنا کہ وہ ایک ایسے اخبار سے وابستہ ہے، جس کا ہر پرچہ ضبط ہو چکا ہے یا قابلِ ضبط ہے۔ پھر معلوم ہوا

کہ کسی مشاعرے میں اسکو پولیس نے دھر لیا۔ پھر ایک ناٹک میں کچھ ایسا فساد انگیز مظاہرہ کیا کہ پولیس نے گھیر لیا۔ مگر اس کی ہستی کچھ ایسی پھیلتی ہے کہ نہ جانے کہاں دبک جاتا ہے۔ وہ جیسے کھٹمل ہوتا ہے۔ تا مضری قسم کا گدی میں کاٹ لو اور اس سے پہلے کہ شکار سنبھلے پنڈلی میں چٹک لیا۔ پنڈلی مسلی تو کمر میں دو دوڑے ڈال لیے۔ تو یہی صفت اس کی ہے۔ گورنمنٹ بلبلا رہی ہے، کھجلا رہی ہے اور سر پیٹ رہی ہے۔ پولیس دوڑ رہی ہے۔ مگر یہ اس کی ٹانگوں میں سے نکل کر بھاگ جاتا ہے۔ کینڈل کورٹ کے سارے کرایہ دار جانتے ہیں کہ وہ یہاں رہتا ہے۔ لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ اسے پکڑوا دے ایک دفعہ کسی نے کوشش کی بھی تو وہ پولیس کے جانے سے پہلے وہی جھینگر بن کر غائب ہو گیا۔ اور پھر کئی مہینے وہ پراسرار پیروں کی چاپ کینڈل کورٹ کے زینوں پر نہ سرسرائی۔ لیکن پھر ایک دن اسی وقت اسی طرح وہ ہزار دن پاؤں ایک لے سُر میں ڈوبے پھر سے اترنے چڑھنے لگے۔ جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے۔ انکا کہنا ہے کہ وہی پھٹا پتلون اور قمیض ہے، وہی پچکے گال اور الجھے ہوئے بال۔ شاید یہ وہی لوٹ کر آگیا ہے۔ مگر شاید کیونکہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔

اور یہ پراسرار قدم ہمیشہ اسی طرح رات کی پراسرار تاریکی میں گونجتے رہے ہیں۔ ایک تھک جائے تو دوسرا جوڑا ان کی جگہ لے گا۔ اور دوسرا تھک جائے گا تو تیسرا اور یہ لامتناہی قدموں کا سلسلہ اسی طرح بغیر لغزش کھائے چلتا رہے گا اور ایک ایک قدم ہزار قدموں میں بستا چلا جائے گا تو یہ کینڈل کورٹ ہے۔ اوپر سے نیچے تک، فٹ پاتھ سے لیکر خالی آسمان تک، اگر آپ کو ایک پلنگ کی ضرورت ہو تو جہنم سے کہیئے...... وہ آپکو نہایت نامعقول پگڑی کے عوض

ایک آدھ کونا کھدرا رہنے کو دے دیگا ــــــ جب لیڈروں کی تصویریں جاگ پڑیں گی، اور شکر میں سے ریت کے ذرے چھان ڈالیں گی۔ ان گیلے کوئلوں کو اتنا دھونکیں گی کہ ان میں سے شعلے بھڑک اٹھیں گے۔ اور یہ ٹھٹھرن اور فاقہ ختم ہو جائیں گے اور موچی کے سر پر کوڑا نہ برسے گا اور کیڈل کورٹ کی چھت پر چھپے ہوئے جھینگر بوسیدہ مال کو چاٹ جائیں گے...

..... مگر نہیں...... بھلا کہیں تصویریں بھی جاگا کرتی ہیں۔

بے کنڈے کی پیالی

"دتّا، ارے او دتّا۔ کہاں مر گیو جاٹے کی؟"

دتّا جوہڑ کے کنارے بیٹھا ٹٹی پھر رہا تھا۔ اُس نے پکار سن کر جلدی جلدی یخ پانی سے اپنے آپ کو پاک کیا اور نیکر گھسیٹتا کھیت کی نالی سے بچ کر چل پڑا۔ پکار سے بالکل مخالف سمت پر یہی تو خرابی ہے دتّا میں۔ ہر کسی کی بات سُنی ان سنی کر دیتا ہے سنتا ہے تو بس پگلے پیرو میاں کی پیرو میاں نے اسے کسی کرم کا نہیں رکھا۔

سکینہ کتنا ہنسا کرتی تھی بس بات بات پر ہنسے ہی چلی جاتی تھی۔ جی چاہتا تھا چڑیل کے دانت توڑ دوں۔ جوان خوبصورت زندہ جو دانت اس کے سانولے چہرے پر بجلی کی طرح کوندا کرتے تھے، پیر محمد سے اس کا پردہ تھا، وہ اس سے گیارہ برس بڑا تھا۔ اس کے پیدا ہوتے ہی پیرو کی ماں نے ٹھیکرے میں روپیہ ڈال کر اسے مانگ لیا تھا،

پیرو کے چچا نور محمد کے آٹھ بچے تھے ۔ ان میں سے ایک تو چیچک میں ٹھنڈا ہوگیا دوسرا جوہڑ میں ڈوب مرا ۔ سکینہ بڑی لاڈلی تھی کیونکہ وہ اکلوتی بیٹی تھی ، چار بڑے بھائی کام کاج کے تھے ،

سکینہ بڑی ہلکی پھلکی تھی ، پیرو اسے گود میں لے کر ادھر ادھر کھیل لیتا تھا ۔ اسے دیکھتے ہی وہ دھمکنے لگتی تھی ، سب پیرو کو چھیڑا کرتے ، اس کی دلہن بڑی بے شرمی سے اسے دل دے بیٹھی تھی ، وہ گود میں لیتا تو چٹاخ سے اس کے گال کا چما لے لیتی ۔ پیرو کی ناک لال ہو جاتی وہ جلدی سے اسے چاچی کی گود میں دینا چاہتا مگر وہ اپنی ٹانگوں کا کنڈل بنا کر اس کی کمر کو پکڑ لیتی اور دہاڑیں مارنے لگتی تب مجبوراً پیرو اسے لے کر بھاگ جاتا ، وہ شرما تو جاتا تھا مگر غصہ نہیں کرتا ، وہ چلبلا کر کبھی اس کا کان کھسوٹ لیتی کبھی ناک پر بکٹا بھر لیتی ۔ مگر وہ ہنستا ہی رہتا ، سکینہ بارہ برس کی ہوئی تو وہ چوبیس برس کا پورا مرد ہو گیا تھا ۔ مگر ابھی تک مہترانیوں میں نہیں گیا تھا ۔ مہتر لوگ گاؤں سے پچاس قدم پر بستے تھے ، ان کے مرد دور دراز شہروں میں روزی کمانے چلے جاتے تھے کبھی دو دو سال نہیں آتے تھے مگر مہترانیوں کی گودیں ہری بھری رہتی تھیں اور کبھی کسی مہتر نے اپنی اولاد کو پرایا مان کر نہیں دھتکارا ۔

"مہتر لوگن ماں جی ہوے ہے" ، بزرگوں کا کہنا ہے ۔

رام کلی اسے دیکھ کر ہمیشہ مسکرایا کرتی تھی ۔ اس کا پتی بمبئی میں کسی فرم میں بڑھی تنخواہ پر نوکر تھا پانچ بچے تھے ، ادھر کئی سال سے اس نے پیسہ بھیجنا بند کر دیا

تھا، سنا تھا کسی میم ہی کو گھر میں ڈال لیا تھا۔ رام کلی بارہ گھروں کا میلا ڈھوتی تھی، تب دو دو روٹیاں خاندان کے حصہ میں پڑتی تھیں، کپڑے لتے کی تو بات ہی مت کرو، گاؤں میں کوئی پرانا کپڑا نہیں بچتا، چیتھڑے کام میں آجاتے ہیں۔ گودڑی پہ جتنے چیتھڑے چپکائے جائیں اتنی ہی بھاری بھرکم ہوتی جاتی ہے۔ رام کلی نظر ماد بھی اور پیر محمد سکینہ کی جوانی کے انتظار میں اتنا مگن تھا کہ ہمیشہ نیچی نظر کر کے کترا جاتا۔

سکینہ اس سے پردہ کرنے لگی تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کھیت پر بتھوے کا ساگ لینے نہیں جاتی تھی۔ کبھی کھیت کی منڈیر پہ آتے جاتے ٹکر ہو جاتی تو وہ سٹ سے گنے کے کھیت میں گھس جاتی اور پیر محمد اپنی ناک لیے ہوئے لپک جھپک گذر جاتا۔ تب اسے وہ چاپا یاد آیا کرتا جب وہ ذرا سی تھی، تب بے جھجک لے لیا کرتی تھی اسے دکھ تھا کہ وہ بڑی کیوں ہو گئی۔ اتنی ہی رہتی اور وہ اسے گودی میں لیے آنکھ مچولی کھیلتا رہتا۔ دوسری طرف اسے اس کی جوانی کا بھی انتظار تھا۔ شب برات کے مہینے میں اس کا نکاح ہونے والا تھا۔ پیرو کی ماں کو کم دکھائی دینے لگا تھا۔ بڑی بہوئیں الگ کوٹھے لے کر رہنے لگی تھیں وہ اپنی خدمت گذاری کے لیے نئی بہو لانا چاہتی تھی۔ اب اس سے اپلے نہیں تھپکتے تھے، ناخون سڑ گئے تھے اور ہتھیلیوں میں قاشیں پڑ گئی تھیں۔

تب ہی ملک تقسیم ہوا۔

نور محمد اور ان کا خاندان بستر باندھ گیا۔ پیرو کی ماں نے بہت کہا لڑکی کا بیاہ

کرتے جاؤ، مگر انھوں نے کہا وہ ہمیشہ کے لیے تھوڑی جا رہے ہیں، تیرہ بگیہہ زمین کوئی چھوڑ کر جاتا ہے، ذرا اسلامی ملک کے دیدار کے لیے جا رہے ہیں، گاؤں میں کچھ قتل و غارت نہیں ہوا، پتا بھی نہ چلتا کہ ملک تقسیم ہوا اگر غنڈے رات کو گاؤں پر حملہ نہ کرتے مگر حملہ ٹل گیا، گاؤں کا بچہ بچہ حفاظت پر ڈٹ گیا، ہندو مسلمان دونوں فرقے لاٹھیاں سنبھالے راتوں کو پہرہ دیتے رہے اور پرندے کو پر تہ مارنے دیا، یہ غنڈے جب کسی گاؤں پر حملہ کرتے ہیں تو ہندو مسلمان نہیں دیکھتے ہیں، بس اندھا دھند لوٹ مار کرنے لگتے ہیں، گاؤں کے مکھیا بابو سنگھ نے کسی کا دھنا گوارا نہ کیا اور سب سے مل کر ایسی پہرہ کی کہ ملک بے اس ہو گیا اور گاؤں کا بال بیکا نہ ہوا، آس پاس کے کسی گاؤں میں خون خرابہ نہ ہوا، بڑے سکون سے رفیوجی آئے اور گاؤں میں بس گئے۔

نور محمد کا خاندان گیا تو سکینہ نے چودھویں سال کو پار کر کے پندرہویں میں قدم رکھا تھا، اگر پیرو کے دین محمد زندہ ہوتے تو سکینہ کو نہ لے جانے دیتے، مگر نور محمد نے بڑی انسانیت سے سمجھایا کہ ٹھیکرے کی مانگ نکاح سمان ہوتی ہے وہ دو مہینے میں واپس آ کر اطمینان سے بیاہ کریں گے۔

مگر ان کے جانے کے بعد پتا چلا کہ وہ اپنی زمین بنتو سنگھ کے ہاتھ چپ چپاتے بیچ گئے تھے، پیرو کے ہوش اڑ گئے، جب دو مہینے گذر گئے اور کوئی واپس نہ لوٹا تو اس کا دم گھٹنے لگا۔

سال بھر پیر محمد چچا کے لوٹنے کا انتظار کرتا رہا۔ لوگ اسے چھیڑتے۔ اس کی

دلہن پردیس چلی گئی، اُسے تڑپتا چھوڑ گئی۔ آخر صبر نہ ہو سکا اور وہ پاکستان روانہ ہو گیا۔

اُسے بہت سے نور محمد ملے مگر ان میں سے کوئی بھی اس کا چچا نہ تھا۔ اکثر کی بیٹیوں کے نام سکینہ تھے مگر وہ سکینہ نہیں ملی جسے وہ گود میں اٹھا کر آنکھ مچولی کھیلا کرتا تھا۔ اور جو چٹاخ سے اس کا گال بڑی بے شرمی سے چوم لیا کرتی تھی۔ وہ بوکھلایا بدحواس اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ کوئی اور عقلمند ہوتا تو وہیں ٹھکانا بنا لیتا مگر اسے اپنی اندھی ماں کا خیال ستانے لگا۔ اس نے سنا پاکستان لاہور سے آگے پھیلا ہوا ہے۔ وہ اتنے لمبے چوڑے ملک میں نور محمد چچا کو کیسے ڈھونڈے گا۔ وہ چاہتا تو محنت مزدوری کر لیتا۔ مگر اُسے انجانے ملک میں وحشت ہونے لگی۔ وہ دھکے کھاتا واپس لوٹ آیا۔ دل میں میٹھا کوئی سہارا تھا۔ نور محمد اس کا سگا چچا ہے۔ باپ کے بعد وہی خاندان کا بزرگ ہے وہ بے ایمانی نہیں کرے گا۔ اور ٹھیکرے کی مانگ نکاح سے کم نہیں ہوتی شریفوں کی زبان جوتے کا تلا نہیں کہ پلٹ جائے سکینہ پیر محمد کی ہے اب وہ کسی دوسرے کی نہیں ہو سکتی۔ شریف زادیاں دوسرے مرد کا منہ نہیں دیکھتیں وہ بس ایک مرد کے نام پر زندگی کاٹ دیتی ہیں ماں نے بہت کہا۔

تو راجی ہوئے تو سلامت کی چھوری سے بیاہ کرائے دوں۔"

مگر پیرو کا دل تو سکینہ کا ہو چکا تھا۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر چلا جاتا۔ گاؤں کے حساب سے تو وہ بوڑھا ہوتا جا رہا تھا لوگ اس پر ہنستے بھی تھے۔ کہ اب تک کنوارا بیٹھا تھا۔ اور یہ معلوم کر کے کہ وہ مہترانیوں کو بھی نہیں چھیڑتا تھا۔ لوگ اس کی مردانگی پر شک کرنے لگے

تھے ....."

پھر اُس دن تو لوگوں کو پکا یقین ہو گیا۔ جس دن وہ یار دوستوں کی زبردستی سے شہر گیا، وہاں انہوں نے پچھاڑ کر دارو پلائی اور ایک تریا کے کوٹھے میں ڈھکیل دیا۔ تریا نے جب سڑے ہوئے دانت نکوسے تو اسے سکینہ کی بجلی کی طرح کوندتی ہوئی ہنسی یاد آگئی اور وہ ننھا سا معصوم بوسہ گال پر سلگ اٹھا جو بھولی لسری دنیا میں ننھی سی سکینہ نے اُسے بخشا تھا، وہ الٹے پیروں بھاگا اور بس اسٹینڈ پر جاکر دم لیا، کڑکڑاتے جاڑے پڑ رہے تھے، جنوری کی کانٹوں دار ہوائیں جسم کو چیرے ڈال رہی تھی، وہ ساری رات موری کے پاس دیوار سے لگا، اکڑوں بیٹھا رہا، صبح جب اس کے دوست عیاشی کر کے بس کے اڈے پر پہونچے تو وہ بخار میں جھلس رہا تھا۔

یہ بخار مہینوں اس کی جان کو لگا رہا۔

پھر کوئی پاکستان کی سیر سے واپس لوٹا تو اس نے بتایا کہ نور محمد کے بڑے ٹھاٹ ہیں، مکان الاٹ ہو گیا ہے، بیٹے چھوٹے چھوٹے بیوپار میں لگ گئے ہیں، نور محمد گوما گاڑی چلاتے ہیں اور سکینہ کا بیاہ ایک بڑے آدمی سے ہو گیا ہے، وہ بڑا آدمی نور محمد سے تھوڑا بڑا ہے مگر اینٹوں کا بھٹہ چلاتا ہے، اس نے سب کو ٹھکانے سے لگا دیا ہے، سکینہ کے دام وصول ہو گئے۔

اس دن پیر محمد بہت ہنسا لوگ کیسے احمق ہیں، سکینہ اس کی دلہن کسی اور کی کیسے ہو سکتی ہے وہ اس کی ہے ہمیشہ اس کے نام پر بیٹھی رہے گی، سکینہ جو اس کی کمر کے گرد اپنی

ٹانگوں کا کنڈل پھنسا دیتی تھی اور جب تک نیند سے آنکھیں نہ مند جائیں اُسے چھوڑنے پر تیار نہ ہوتی۔ وہ اُسے اتارنا چاہتا تو گردن میں جھول جاتی اور اس کے کانوں کی لو چبا ڈالتی بڑے تیز تھے، سکینہ کے دانت جیسے میٹھی میٹھی سوئیاں کتنی گدگدی ہوتی تھی،

مگر اس دن سے نہ جانے کیوں پیر واندر سے ٹوٹ گیا۔ کھیت پہ جانے کے بجائے شہر کی طرف چل دیتا، پانچ چھ میل نکل جاتا، گلیوں میں گھومتا رہتا، کھیتی کے بجائے اگر وہ کوئی بیوپار کرے تو سکینہ کو بیاہ کر لا سکتا ہے، سکینہ کھیتوں میں نہیں شہر میں رہتی ہے، اس کے باپ بھائی کھیتی چھوڑ کر بیوپاری بن بیٹھے ہیں۔ وہ ان سے بڑا بیوپاری بن کر جائے گا۔ پاکستان میں دھوم مچ جائے گی۔ لوگ بیٹیاں لے کر آئیں گے، تب نور محمد بھی آئے گا۔ اور اپنا حق جتلائے گا، تب وہ کہے گا،

وہاں کے بنا شادی نا کر نگو، باکو پہلے بلا لے بھیجو۔ تب ماں بھی جائے گی، بھائی بھی نخرہ چھوڑ کر اس کے بیاہ میں جائیں گے دلہن گھر میں آجائے گی تو چاندنا کھل اٹھے گا، وہ سر جھکائے کوٹھریا میں بیٹھی ہوئے گی۔ دولہا اس کا گھونگھٹ اٹھائے گا، تب وہ اپنے نرم نرم جلتے ہوئے ہونٹ اس کے گال پر رکھ دے گی اور اپنی سڈول ٹانگوں کے کنڈل میں جکڑے گی،

بوہڑ کے کنارے بیٹھے بیٹھے اس کا جسم پگھلنے لگتا، چنگاریاں سی پھوٹنے لگتیں، رس پھوٹ نکلتا اور وہ بوہڑ کے پانی میں آدھا ڈبو دیتا، اور طوطے امرود اور بیر کے درختوں کا کباڑہ کرتے رہتے اسے ہوش نہ رہتا، مگر اُسے گالیاں سناتا، کھیتوں پر جا بوتی

نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس لیے وہ بیرامرود کی رکھوالی کرنے لگا تھا دو وقت کی روٹی مل جاتی، ماں بہو لانے کا ارمان لیے اللہ میاں کو پیاری ہو گئی۔ اُسے بھینسوں کی کوٹھڑی میں منتقل کر دیا گیا۔ بھینسوں سے اسے کوئی کد نہ تھی، وہ تو اسے ٹلتے رہتیں، نہ اس کا مذاق اُڑاتیں مزے سے جگالی کیا کرتی اور گوبر کئے جاتیں، سکینہ کہتے۔ سڈول اُپلے تھاپتی تھی، پتلے پتلے کہ دم بھر میں سوکھ جاتے اور جلدی بھی سلگ اٹھتے۔

مگر جب وہ اسے پاکستان سے بیاہ کر لائے گا تو اپلے نہیں تھاپنے دے گا، اس کے مہندی لگے ہاتھ چومتا رہے گا۔ اور جو پیڑ کا پانی آگ بجھا دیتا۔

دنا اکھڑ نو برس کا تھا، اس کا ماں بہت بانکی تھی، باپ کلکتہ میں گم ہو گیا۔ پیسے آنے بند ہو گئے۔ سوتن تارہ چنٹیٹی تھی، اسے میلا ڈھونے سے نفرت تھی، کھیت رکھایا کرتی تھی اور آتے جاتے سے آنکھ لڑاتی تھی، اُسے نہ جانے کیوں سات خون معاف تھے، وہ پیال میں قلابازیاں لگاتی تھی، اور کھیت میں سور کلیلیں کرتے تھے۔

ایک دن باہر سے کوئی دلال آیا اور اسے پھسلا کر لے گا، تب دُنا اکیلا رہ گیا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ بمبئی میں فلم اسٹار بن گئی ہے۔ دُنا ہیما مالنی اور ریکھا کی تصویریں دیوار پر چپکی دیکھ کر پہروں کھڑا گھورتا رہتا ہے۔ اُسے سب ہیروئنوں کی صورت ماں جیسی ہی نظر آتی ہے۔ ایسی ہی تھی۔ اس کی ماں چنچتی گیہوں کی بال کی طرح لچکتی۔ اس کے پیٹ کے بیچ میں بھی ایسا ہی بھنور جیسا سوراخ تھا جس پر منہ رکھتے ہی دُنا کو نیند آنے لگتی تھی۔ سنا ہے اس کے پاس بھی بنگلے ہیں اور نوٹوں کی گڈیاں مکان کی چھت

میں دبی ہوئی ہیں جب وہ آئے گی تو اپنے سنگ لٹو اور تیر کمان لائے گی، لٹو چوک میں نچائے گا، اور تیر کمان سے باغوں میں طوطے اڑائے گا۔

جیسے لوہا مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے اسی طرح دنا پیرو میاں کی طرف کھنچا اور اُن سے چپک گیا، جب پیرو میاں اور دنا کہیں جا رہے ہوں تو ایسا لگتا ہے پیرو میاں کا ایک ٹکڑا الگ ٹوٹ کر ان کے ساتھ ساتھ پیچھے چل رہا ہے، کسی جنم میں وہ ضرور باپ بیٹے رہے ہوں گے، شروع شروع میں لوگوں نے بہت ٹوکا، تم شیخ زادے بھنگی کے لونڈے کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہو، کھاتے پیتے ہو شرم آنا چاہیے۔

مگر باوجود کوشش کے پیرو میاں کو شرم نہ آپائی

پیرو میاں نے دنا کو اپنے ساتھ بیوپار میں لگا لیا ہے، کڑاکڑاتے جاڑے میں صبح دم دونوں کام پر نکل جاتے، پیرو میاں کو کسی نے ایک گھٹنا ہوا اوور کوٹ دے دیا جو وہ ہر جاڑے میں پہن لیتے ہیں، کبھی نہیں اتارتے اسی میں سوتے ہیں

اسی میں جنگل جاتے ہیں۔ دنا کے لیے بھی ایک صاحب بہادر کے بیرے نے ایک ڈنر جیکٹ دے دیا ہے کبھی اس جیکٹ کو پہننے والا صاحب اسے پہن کر ڈنر کھاتا ہوگا، حسین لڑکیوں کے ساتھ رقص کرتا ہوگا

دنا سٹھرا ہوا ہے، یہ کوٹ اس کے ٹخنوں تک آتا ہے اسے پہن کر وہ جیسے ایک گرم گرم کوٹھری میں بند ہو جاتا ہے، ٹوٹے بٹنوں کی جگہ سُتلی بندھی ہوئی ہے سر پر ایک صوتی کنٹوپ منڈھا رہتا ہے جو اسے اپنے کاروبار کے سلسلے میں مفت

ہاتھ آگیا تھا۔

پیرو میاں اور دُنا شہر اور قصبہ میں پرانا سامان، بیچتے پھرتے ہیں، لوگ گودڑے میں بڑے کام کی چیزیں پھینک دیتے ہیں۔ خالی شیشیاں اور ڈبے میلے چیتھڑے جنھیں بوہڑ پر دھو کر سکھا لیا جائے تو بھنگی لوگ اپنی گدڑیوں میں جوڑنے کے لیے بڑے شوق سے خریدتے ہیں۔ ان چیتھڑوں پر کبھی جلیبی دھبے ہوتے ہیں، دو آنے کے کھار دار صابن سے بھی نہیں چھوٹتے پیرو میاں اور دُنا اِن کپڑوں کو جوار اور مکئی کے بدلے میں بیچ لیتے ہیں۔ شیشیاں بھی ڈبوں کے ساتھ بک جاتی ہیں۔ ٹوٹی چوڑیاں لڑکیاں بالیاں چراغ کی لو دکھا کر موڑ کر کنڈے بنا لیتی ہیں۔ اِن کنڈوں کو جوڑ کر بڑے نفیس ہار بن سکتے ہیں جو دیوار پر لٹکا دو تو کوٹھا جگمگا اٹھتا ہے۔

مگر کچھ حاسد قسم کے لوگ کہتے ہیں، سوں تارا ممبئی کے رنڈی بازار میں بک گئی۔ اب وہ سر پر میلے کا ٹوکرا ڈھونے کے بجائے میلے میں کمر تک گڑ گئی ہے۔ ایک دن یہ میلا اس سے اوپر چلا جائے گا اور وہ سڑک پر کوڑھیوں کی ٹولی میں جا ملے گا۔

بکواس کرتے ہیں، پیرو میاں دُنا کو سمجھاتے ہیں۔ ایک دن اپنے موٹر کار میں بیٹھ کے آئے گی تب دیکھنا سب بدمعاش منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔

دُنا انہیں اپنا پیرو مرشد مانتا ہے اور عقلِ کل سمجھتا ہے۔ ان کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ موتی سمجھ کر چن لیتا ہے۔ پیرو میاں پہنچی ہوئی باتیں کرتے ہیں۔

نبے سالے انگریز کہ ہوئیں تھے بڑے گیل ہوئیں تھے، جراسی بات پر لات مارین تھے، پھلی (تلی) پھاڑ دد کریں تھے، بن کے جوتن میں گگے، بڑی بڑی کیلیں ہو نئیں تھیں، سجی ماں پھ جائیں میں تھیں، جاؤڑ کے نگین بے سانس اونا لیے دئیں کاؤمیں ڈھیر ہو جائے۔

" بے گورا لوگ تمن نے دیکھے پردمیاں! دُنا پوچھتا،

کائے کونا دیکھے! ابوت دیکھے،

" تمائے ٹھوکر ناماری،

" نا اللہ ہم بن کے پاس نا سکیں تھے، بے بڑے بڑے بنگلس ماں رہین تھے بنکے پاس تو بڑے بڑے لوگ جائیں تھے، بنکے بڑے بڑے بوٹ ہو ئیں تھے،

جاکو ٹھریا چتے بڑے۔

ارے للہ جاؤتے بڑے!

بے جوتا پہر کے ہرڈو میں کیسے چرڑین تھے،

" ارے للہ بے ہرڈو پہرڈ پہ نا چڑھتے بے تو موٹر کاٹ میں آئیں جائیں ہیں۔"

" ٹی ٹھرے کو موٹر کاٹ میں جائیں،

" ابے ٹی تو بے پالین ماں پھرت ہیں۔"

" بائی ماں کھا ئیں بائی میں ٹی ٹھریں ہم؟

" نابے دوسرے پیالے ہو ئیں ہیں. ' سے کھائیں ہیں،

"پیرو میاں؟"

"ہاں للہ"

"ماں چھنال تھی؟" دنّا ایک دم موضوع بدل دیتا ہے۔

"تھی تو للہ! پیرو میاں بڑے تکلف سے کہتے۔ انہیں عورتوں کے بارے میں زیادہ علم نہیں۔ انہوں نے تو بس ایک ننھی سی عورت کو گودوں کھلایا تھا جو دور چلی گئی، مگر اب تک دل میں بسی ہوئی تھی۔

"پیرو میاں"

"ہاں للہ"

"سکینہ بی بی کب آئے گی"

"بس عید کے بعد آ جائے گی"

دنّا طرح دے گیا۔ وہ جانتا تھا سکینہ بی بی اب نہ آئے گی پیرو میاں تو پگلے ہیں۔ ہر دفعہ کہتے ہیں عید کے بعد آئے گی، بکر عید کر کے آئے گی، مگر کتنی ہی عیدیں بکر عیدیں گذر گئیں، سکینہ بی بی نہیں آئی۔ اچھا ہی ہے سکینہ بی بی نہ آئیں وہ آ گئی تو پیرو میاں ہر وقت کوٹھے میں گھسے رہیں گے، سارا کاروبار ٹھپ ہو جائے گا۔

کاروبار منافع بخش بھی تھا اور دلچسپ بھی۔ لوگ کیسے لاپرواہ ہوتے ہیں، دنّا کو کوڑے میں ایک دن ایک قریب قریب ثابت گیند ملی، ذرا سا سوراخ تھا اور پچک جاتی تھی، پیرو میاں نے اس کے سوراخ پر ذرا سا آٹا لگا کر دھوپ میں رکھ دیا۔ بالکل

نئی ہو گئی، ایک دن ایک بندہ ملا بس اس کا کنڈا ٹیڑھا ہو گیا تھا جسے پیرو میاں نے سیدھا کر دیا۔

بندے کو دیکھ کر پیرو میاں اپنے کان کی لَو ٹٹولنے لگے، سکینہ ان کے کان کی لَو چبا ڈالا کرتی تھی اور پھر ایک دن کوڑے کے ڈھیر میں دبی ہوئی دنا کو ایک چائے کی پیالی ملی، پیالی دیکھ کر وہ سناٹے میں رہ گیا، اس نے اتنی نازک اور خوبصورت چیز زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی، اس کی زبان تالو سے چپک گئی، سہم کر اس نے چاروں طرف دیکھا، کوئی دیکھ تو نہیں رہا، ضرور پیالی کسی نے بھولے سے پھینک دی ہو گی، پیالی بالکل ثابت تھی صرف کنڈا ٹوٹا ہوا تھا، کسی مشاق کاریگر نے بڑی جانفشانی سے سوئی کی نوک سے اس پر نقش و نگار بنائے تھے، پورا گلزار کھلا ہوا تھا، پھول اور کلیوں کے گچھوں پر ننھی ننھی چاول برابر چڑیاں بیٹھی تھیں، جن کی دُمیں دھنک کے رنگوں کی طرح حلقہ بنائے ہوئے تھیں دنا کو ایسا لگا وہ کسی دیس کا راج کمار ہے، اور اس جادو سے بنائے ہوئے چمن میں پریوں کے جھرمٹ میں کھڑا ہے۔

"جا کو کنڈو تو ٹوٹ گیو ہے۔" پیرو میاں نے ناک سکیڑی۔

"کنڈا؟"

"ہائے لے دیکھ لو، اِدھر کنڈا ہو لے ہے تا میں انگری ڈار کے چا پیئیں ہیں صاحب لوگ۔" گاؤں میں سب چائے کٹورے یا گلاس میں پیتے ہیں، دنا

نے کبھی کنڈے دار پیالی نہیں دیکھی تھی اگھو اس کی زندگی میں کوئی کنڈا تھا۔ وہ تو دیپو میاں کا کنڈا تھا جب گھام میں دھوپ کھانے کو دونوں پاس بیٹھتے تو ایسا معلوم ہوتا ایک میلی سی چائے کی پیالی دیوار سے لگی رکھی ہے۔

پیرو میاں باون ترپن برس کے ہوں گے مگر تمام بال سفید ہو گئے تھے، لوگ انہیں ڈوکرا کہتے تھے، مہتر کے لونڈے کے ساتھ کھانے پینے پر انھیں خاندان نے برادری باہر کر دیا تھا۔ سون تلاجب سے بھاگی تھی اس کی کوٹھری میں اس کی ساس بھینس اور بکریاں باندھنے لگی تھی۔ وہیں کونے میں پیرو میاں اور دنیا پیال پر بوری ڈال کر پڑے رہتے تھے۔ گرمیوں میں تو سارا جگ بچھونا بن جاتا ہے ہاں برسات اور جاڑوں کی اور بات ہے تب تو ڈھور ڈنگر بھی سر پر سایہ مانگتے ہیں۔

جاڑے کیا آتے ہیں گاؤں پر ایک عذاب نازل ہو جاتا ہے، ہرے بھرے کھیتوں کو پالا مار جاتا ہے۔ اگر بارش نہ ہو تو بالی نہیں پھلتی اور بارش ہوتی ہے تو کھیت لہلہاتے ہیں، مگر کھیت والے کمہلا جاتے ہیں، کھانسی، بخار، دمہ، گٹھیا، سر اٹھاتے ہیں، عام طور پر تو گیہوں جلا کر باریک پیس لیے جاتے ہیں انہیں اونٹا کر ایک قسم کی کافی سے ملتی جلتی شے سی تیار کر لی جاتی ہے۔ اس میں گڑ یا راب چھوڑ کر پینے سے بڑا سکون ملتا ہے اور یا تو تھک ہار کر بخار چھوڑ جاتا ہے یا مریض دنیا چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے، کھانسی کے لیے کچا امرود بھوبل میں دبا دیکھ گرم گرم کھا لو اکسیر کا کام دیتا ہے، ہاں جب دم لبوں پہ آ جاتا ہے تو گاؤں کے اکلوتے

ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں، نہ جانے وہ کیسے ڈاکٹر بن بیٹھا ہے، کسی نے اُسے ڈگری دینے کی زحمت گوارا نہ کی تو کمبوڈر ہی گاؤں میں جم گیا۔ ویسے ویدجی بھی ہیں عموماً اپنی بکریوں کے لیے چارہ توڑتے نظر آتے ہیں۔

پیرو میاں کا جب دم گھٹتا تو وہ ساری رات اکڑوں بیٹھے دھونکنی چلاتے رہتے۔ المونیم کے پیالے میں دتا ان کے لیے پانی کھولاتا اور اس میں گڑ چھوڑ کر پینے سے ذرا دم آجاتا گر نہ ہوتا تو نمک کی چٹکی ہی کام کر جاتی۔ صبح کو ذرا دیر دھوپ میں بیٹھتے تو سانس سینے میں سمانے لگتی، اور وہ اسی طرح ہانپتے ہوئے بیوپار کی فکر میں چل نکلتے۔

جس دن بے کنڈے کی پیالی لے کر پیرو میاں اور دتا واپس گاؤں پہونچے ایک کھلبلی مچ گئی، گاؤں کے بچے جوق در جوق اس عجوبہ روزگار کو دیکھنے ٹوٹ پڑے جو دیکھتا دنگ رہ جاتا کسی کو اس کے کنڈے کی غیر موجودگی کا احساس بھی نہ ہوا۔

ویسے گاؤں میں لالہ جی کے ہاں چائے کی پیالیاں تھیں، مگر انہیں کسی نے نہیں دیکھا۔ کسی بڑے آدمی کے آنے پر نکالی جاتی تھیں۔ اور نائن اپنے ہاتھ سے دھو کر واپس تلے میں بند کر دیتی تھی، مگر برسوں سے ادھر کوئی اتنا بڑا آدمی نہیں آیا تھا کہ چائے کی پیالیوں کو تکلیف دی جاتی، وہ بھی تعداد میں چار تھیں اور نہایت موٹی اور بھدی تھیں۔

اسکول ماسٹر نے پیالی کے پیندے کو پڑھ کر بتایا تھا کہ وہ میڈ ان انگلینڈ تھی۔ ضرور اس میں کوئی صاحب بہادر چائے پیا کرتا ہوگا اور ملک کو جاتے وقت کنڈہ لے گیا پیالی بھول گیا۔ بھول ہی گیا ہوگا، ورنہ کنڈہ نہ ہونے کے بعد بھی پیالی نہایت کار آمد تھی۔ گرم گرم چائے بھر کر دونوں ہتھیلیوں میں تھام لو مزے سے پیو۔ ہتھیلیاں بھی گرم اور مزے میں ذرہ برابر فرق نہیں۔

فوراً دنا گیا اور چائے والے کی دوکان سے چائے مانگ لایا۔ وہ اس کی بکریاں چرایا کرتا تھا اور روز باجرے کی موٹی سی روٹی ملتی تھی۔ اس دن اس نے روٹی کے بجائے چائے لے لی۔ گڑ تھا ہی کہ پیرو میاں نے کل ہی خالی شیشیاں اور ڈبے بیچے تھے۔ چائے بنی اور پیرو میاں نے پی پھر اسی میں دنا کو ملی دنا پر نشہ سا طاری ہو گیا۔ اتنی میٹھی اور گاڑھی چائے اس نے زندگی بھر نہیں چکھی تھی۔ ہینڈ پمپ پر پیالی دھو کر اس نے یوں ہی دو گھونٹ پانی کے پی لئے پیالی میں پانی جیسے شربت بن گئے، وہ تو نہ جانے کتنا پی جاتا اگر پیرو میاں ڈانٹ نہ بتاتے، اتنا ہی پانی پیئے گا تو ساری رات نیکر بھگو لے گا۔

دوسرے دن گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ پیرو میاں اور دنا شہر سے ولایتی پیالی چرا کر لائے ہیں۔ انھوں نے بہت قسمیں کھائیں کہ کوڑے میں پڑی ملی ہے، مگر کسی نے یقین نہیں کیا۔ بھلا ایسا کون سر پھرا ہوگا کہ ولایتی پیالی گھوڑے پہ پھینک دے۔

گاؤں کا تھانہ ایک اُجڑی ہوئی مگر نیم پختہ عمارت میں ہے، تین چار سپاہی رہتے ہیں، زیادہ وقت اونگھا کرتے ہیں۔ اور جب رات کو چور کسی کا کھیت لوٹتے ہیں تو بڑی گہری نیند سو جاتے ہیں، انہیں لٹھ بازی مطلق پسند نہیں چوروں کے چلے جانے کے بعد اٹھتے ہیں بڑی سرگرمی دکھاتے ہیں، اِدھر اُدھر ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہیں، جس کی چوری ہوئی ہو اسے گھنٹوں بٹھلاتے کاغذی کاروائی کیا کرتے ہیں، نتیجہ ہمیشہ صفر ہی نکلتا ہے، گاؤں والوں کا خیال ہے چور لوگ انہیں کچھ حصہ دیتے ہیں۔ پچھلے دنوں جب رام پرساد کے ہاں شکرقندیوں پر دھاڑ پڑی تو ہر وقت پولیس والوں کے بچے شکرقندیاں کھاتے نظر آتے تھے، پولیس والوں کی بکریاں چاہے جس کھیت میں گھس جائیں کسی کی مجال نہیں جو انہیں کانجی ہاؤس میں دے آئے، اُن کے سؤر سارے بھنگیوں کا ستیہ ناس مار دیتے ہیں کوئی دم نہیں مارتا ہر دکان سے کچھ نہ کچھ منگواتے رہتے ہیں ادائیگی کے لیے تقاضہ کرنے کی کسی میں ہمت نہیں ورنہ اس کا فوراً کسی مد میں چالان ہو جائے اور کھینچا کھنچا۔ پھرے جھوٹی گواہی دینے کو بہتیرے تیار۔

ولایتی پیالی! کانسٹیبل چرنجی لال چونک پڑے، دلیسی ہوتی تو خیر ایسا اندھیر نہ ہوتا۔ اپنے میلے کوٹ پر پیٹی کس کر اٹھ کھڑے ہوئے اور بھنگیوں کی کالونی کی طرف روانہ ہوئے، جلو میں لونڈے اور کتے لگ لئے جب یہ قانونی چارہ گر ملزموں کی جھونپڑی پر پہنچے تو دونا کنڈیں میں بابے کا انتا مسل

رہا تھا اور پیرو میاں تین اینٹوں کے چولھے میں جھانکڑ اور پھپٹیاں دھونک رہے تھے۔ مٹی کا توا دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ پاس ہی ایک ہنڈیا لڑھک رہی تھی۔

"کے پیرو میاں آج کو تم کاتے ہاتھ ماریو؟ چر کی لال عزائے۔"

"کیول نا سرکار۔ پیرو میاں کھلتے۔"

"ہم نے تم نے کتنی بار کے دی گئے" "چوری چکاری نا چلئے گی۔"

"ہم نے کا چوری کری؟"

"گے بلائتی پیالی تمار دیپ دے گیو؟"

"سرکار جے تو ہم لے کوڑا میں پڑی پائی ہے۔"

"اور جے بھنگی کا چھورا بھی کوڑا میں پڑو پایو؟"

پھورے کی بات پیرو میاں کی دکھتی رگ تھی۔ پھورے کو انہوں نے چپکے سے کلمہ پڑھا لیا تھا۔ پتا نہیں دنا کا پڑھا ہوا کلمہ اللہ پاک کے پلے پڑا ہوگا۔ یا نہیں مگر بڑا گمبھیر معاملہ تھا اگر کسی کو پتہ چل جاتا تو وہ تبلیغ السلام کے الزام میں دھر لیے جائیں۔ مگر ان کے دل کو اطمینان ہو گیا تھا۔ اور دنا کو کوئی فرق نہ محسوس ہوا تھا۔ وہ کنڈے کی طرح پیرو میاں سے جڑ کر پیالی کی قربت سے خود کو بڑا محفوظ سا سمجھتا تھا۔ ویسے کنڈے کا تو دنیا میں کوئی مصرف نہیں ہوتا۔ لیکن پیالی کے ساتھ، اس کا ایک مقام پیدا ہو جاتا ہے۔ جب

اُسے بخار چڑھتا تھا، اور ڈراؤنے خواب ستاتے تھے تو وہ پیرو میاں کی پچکی ہوئی چھاتی سے چمٹ کر جیسے ماں کی گود میں دم جاتا تھا، یہ اکیلا پن کتنا موٹا اور ڈراونا ہوتا ہے اور دنا ابھی آٹھ برس کا نہ ہوا تھا،

"یہ رہی پیالی" پیرو میاں نے پیالی کوٹے میں رکھی ہوئی مٹکی سے نکال کر چرنجی لال کو دکھائی، دنا کا کلیجہ پیالی میں لٹا چلا گیا۔

"ارے جی سالی تو ٹوٹی بھی ہے، جائیں کنڈ اتھ ہی نا، چرنجی لال نے پیالی زمین پر پھینک دی اور پلٹ کر چلے دیے،

ایک چیخ مار کر پیالی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی،

دوسری چیخ دنا کے گلے میں گھٹ گئی آنا نے ہاتھوں سے اس نے پیالی کے ٹکڑے چھوئے جیسے دیکھ رہا ہو، شاید اب بھی اس میں جان باقی ہو۔

"رو نا للا گے پیالی آٹا سے جوڑ دونگو" پیرو میاں نے سمجھایا۔ دنا بھاگا۔ بھاگا گیا۔ اور بنیے کے ہاں سے گیہوں کا آٹا مانگ لایا، پیرو میاں نے آٹا گھول کر اسے پیالے میں پکایا۔ دم بھر میں پیالی جڑ گئی اور بالکل نئی معلوم ہونے لگی، غور سے نہ دیکھو تو جوڑ بھی نہیں دکھائی دیتے تھے۔

"جائے گھام ماں رکھ دے"۔ للا نے رساں سے پیالی اٹھائی اور دھوپ میں رکھ دی۔ روٹی کھاتے میں وہ بار بار جھانک کر پیالی کو دیکھتا رہا، پھر جا

کر اس کے قریب بیٹھ کر اس کے سوکھنے کا انتظار کرنے لگا۔ لپاک جھپاک بھاگتی ہوئی رات آن پہنچی، کئی بار پکارنے پر ڈنا بڑی مشکل سے اندر آیا وہ تو پیالی سا تھلانا چاہ رہا تھا مگر پیرو میاں نے سمجھایا کہ صبح تک دھوپ کے انتظار میں رکھی رہے تو اچھا ہے، ابھی جوڑ کچے ہیں۔ ہلانے ڈولانے سے کھُل جائیں گے۔

کیا غضب کی سردی تھی، برف کی سلاخیں جسم کے آر پار ہوئی جاتی تھیں۔ گرمی میں تو جوہڑ میں ڈبکی لگاؤ ائیر کنڈیشن کا مزہ لے لو، مگر جاڑہ تو خدا نے صرف انسانوں کو عذاب دوزخ کا عادی بنانے کے لیے بھیجا ہے، سورج کی انگیٹھی جب تک روشن رہتی ہے، زندگی جینے کا جھولا جھولتی ہے۔ مگر چار بجے سے سورج دم توڑنے لگتا ہے۔ دھوپ ہوتی ہے مگر ٹھنڈی، پھر ہوا ابھی سر اٹھاتی ہے، ہر مسام سے برف کی سوئیاں اندر اتر جاتی ہیں۔ اور ہڈیوں میں بیٹھنے لگتی ہیں۔ جان پڑتا ہے ناک منہ پر ہے ہی نہیں۔ اور جو ہے، سو کوئی دم میں برف کی ڈلی بن کر کھٹ سے گر جائے گی۔ پانی بچھو کی طرح ڈنگ مارتا ہے۔

صبح سویرے پیرو میاں کی آنکھ کھلی تو ڈنا غائب تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بارش ہو رہی تھی، بارش میں ملیچھ کہاں نکل گیا۔ مئی گیا ہو گا، باہر جانے کی کیا ضرورت تھی۔ جہاں جانوروں کا اتنا گوبر تھا۔ وہاں تھوڑا سا میلا اور سہی۔

"ڈنا، ارے او ڈنا۔" انہوں نے پکارا۔ پھر ان کا دل دھک سے ہو گیا۔ جوہڑ کے

پاس کوئی کالی چیز پڑی تھی۔ کوئی بکری مر گئی رات کو، باہر رہ گئی ہو گی، مگر جی نہ مانا۔ انہوں نے بورا اوڑھ کر اس کالی شئے کی طرف بڑھنا شروع کیا۔

ڈُنا کندے کی طرح مڑا ہوا پڑا تھا۔ اس کے سر سے خون نکل کر جم گیا تھا، ہاتھوں میں آٹے سے جوڑی ہوئی پیالی اب تک دبوچے ہوئے تھا۔ اس کے جوڑ کھل گئے تھے۔ انہوں نے اسے اٹھانا چاہا، مگر وہ اکڑ چکا تھا۔ انہوں نے بوری اتار کر اس پر ڈال دی۔

دوپہر کو پانی تھم گیا، اور دھوپ نکل آئی۔

جب دتّا کو آگ دی گئی تو پیرو میاں منہ موڑے دیوار سے لگے بیٹھے رہے، چتا کی دھیمی دھیمی آنچ ان تک پہنچ رہی تھی۔ ڈُنا انہیں اپنی آخری گرمی دے رہا تھا۔

دور سے انہیں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا، ایک میلی سی خالی چائے کی پیالی دیوار سے لگی رکھی ہے، جس کا کُنڈہ ٹوٹ گیا ہے۔

✣ ✣ ✣

چراغ روشن ہیں

تھرڈ کلاس کے ڈبے میں غضب کی بھیڑ تھی۔ ریل بری طرح ہچکولے کھا رہی تھی۔

دہلی ریڈیو اسٹیشن سے کہانی پڑھنے کے لیے بلاوا آیا تھا اور میں جودھپور سے دہلی جا رہی تھی

شاہد احمد دہلوی کو تار دے دیا تھا، وہ مجھے اسٹیشن پر لینے آ گئے۔

ریڈیو اسٹیشن کا کافی رعب پڑا، یہاں کرشن چندر سے میری پہلی بار ملاقات ہوئی ویسے

ملاقات تو زندگی کے موڑ پر ہو چکی تھی۔ میں نے اس وقت بس دو چار کہانیاں لکھی تھیں۔

کرشن کی میرے دل میں بڑی قدر تھی، چندر نئے لکھنے والوں میں ان کی حیثیت بڑی نمایاں

تھی، منٹو اور بیدی سے بھی روحانی ملاقات تھی

کرشن کو یوں سامنے جیتا جاگتا دیکھ کر دل میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ وہ اس وقت

سی گرین سوٹ اور سرخ ٹائی میں بے طرح جچ رہے تھے۔ چھوٹے قد کے باوجود خاصے ہینڈسم

لگ رہے تھے۔ تب ان کے سر پر پورے گھنے بال تھے۔ اس کے بعد میں نے انہیں کبھی یوں سجا

بنا نہیں دیکھا۔ جب بمبئی میں دوسری بار ملاقات ہوئی تھی تو وہ گنجے ہونا شروع ہو گئے تھے۔

ملگجی سی قمیض اور یوں ہی سی پتلون میں کچھ کھوئے سے اکتائے ہوئے بیٹھے تھے، منٹو کے گھر میں چند لوگ جمع ہو کر پی رہے تھے۔ منٹو کی زبان سے پھلجڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ وہ بار بار کرشن کو باتوں کے سلسلے میں گھسیٹتا، مگر کرشن کچھ جھینپے سے نہایت مختصر جواب دے دیتے، پھر وہ پنجابی میں کچھ فوں فاں شروع کر دیتا مگر کرشن جیسے اسے بچہ سمجھ کر ٹال رہے تھے۔ وہ ہولے سے مسکراتے اور ان کی حساس آنکھیں کہیں دور خلا میں کچھ ڈھونڈھنے لگتیں۔

جب باوجود روکنے کے کرشن اٹھ کر چلے گئے تو منٹو بڑی دیر تک بڑبڑاتا رہا۔ مجھ سے اُلجھ پڑا کہ میں کرشن سے مرعوب کیوں ہوں۔

"منٹو میں اور تم غلاظت کے ڈھیر کریدتے ہیں اور گند اچھالتے ہیں، کرشن کا قلم باریک سوئی کی طرح بیل بوٹے سنوارتا ہے۔" میں نے منٹو کو چھیڑا اور وہ لڑ پڑا مگر تھوڑی دیر کے بعد کچھ بجھ سا گیا۔

"انسان کی زندگی میں جو محرومیاں ہیں ان کی عکاسی بہت خوبصورتی سے کرتا ہے۔" منٹو خود ہی قائل ہو کر بولا۔ ہم بڑی دیر تک کرشن پر بحث کرتے رہے، اور قائل ہو گئے کہ مختلف ہوتے ہوئے بھی کرشن سے دماغ کا کوئی حصہ بے طرح متاثر ہوتا ہے، اور سب سے بڑی خوبی اس کی تحریر میں یہ ہے کہ ایک جال سا بن دیتا ہے، جس میں پھنس کر انسان ان راہوں پر سوچنے لگتا ہے جن راہوں پر کرشن کا قلم چل رہا ہو۔

"ان داتا" پڑھ کر میرے دل میں کرشن کی دہشت بیٹھ گئی۔ ایسا لگا کوئی تحریر نہیں فلم دیکھ رہی ہوں۔ منٹو سے میری بڑی لڑائی ہوئی۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں اسے جلانے کیلئے

بار بار "ان داتا" کو بکھراتی ہوں، مگر حقیقت یہ ہے کہ میں نے بنگال کے قحط کو صرف "ان داتا" کی عینک لگا کر دیکھا۔

چھیالیس، سینتالیس کے ادھر اُدھر ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی۔ سب ہی لکھ رہے تھے مگر کرشن چندر کا قلم قلانچیں بھر رہا تھا۔ انہوں نے دو فلمیں بھی بنائیں۔ ان میں بھی اپنے خیالات کی عکاسی کی کوشش کی۔ چلنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ اس وقت ایسی فلموں کی کوئی وقعت بھی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ اگر سرائے کے باہر، "راکھ" اور "دھرتی کے لال" جیسی فلمیں آج بنتی ہیں تو ہٹ نہ ہوتے ہوئے بھی سراہی جاتی ہیں، مگر اس وقت تو ایسا معلوم تھا کرشن وقت اور پیسے کی بربادی کر رہے ہیں، پھر بھی ان کے قلم کو پَر لگ چکے تھے۔ وہ انوکھی سمتوں میں اڑانیں بھر رہا تھا لکھنے والوں کا جو گروہ ادب پر چھایا ہوا تھا۔ ان میں کرشن کا قد سب سے بلند تھا۔ اس زمانے میں ترقی پسند بڑے زور و شور سے میٹنگیں کرتے تھے۔ کرشن بھی ان میں بڑی پابندی سے شرکت کرتے۔ ان کے بال اور جھڑ چکے تھے، کپڑے عموماً خاموش نظر آتے تھے، بس ان کا قلم بول رہا تھا۔

پھر ملک تقسیم ہوا۔ کرشن کا قلم لہولہان ہو کر خون اگلنے لگا۔ وہ فساد کے مارے شرناتھیوں میں گھل مل کر ان کے خونِ دل سے روشنائی کا کام لیتے۔ قصداً یا شاید انجانے میں انہوں نے بھڑکے ہوئے شعلوں پر پانی چھڑکا۔ ان کہانیوں کو پڑھ کر نہ جانے کتنے دلوں سے نفرت اور خونریزی کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔

کرشن چندر پر مضمون تو لکھنے بیٹھ گئی ہوں مگر یادوں کی ایک یلغار ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں اور کیا چھوڑ دوں۔ ادیب کو اس کی زندگی اس کے دوستوں اور اس کے ماحول سے کیسے الگ کر لوں۔ دوسرے اگر میں چاہوں بھی کہ صرف ان کی تخلیقات پر قلم اٹھاؤں تو یہ میرے بس کی بات نہیں، یہ تو کسی نقاد کا کام ہے۔ میں تو کرشن کو ایک پیارے دوست ایک حساس انسان کی طرح جانتی پہچانتی ہوں وہ انسان پہلے تھے، ادیب بعد میں ہوئے۔

کوئی زور شور کی میٹنگ میرے گھر میں چل رہی تھی۔ کرشن کی غیر موجودگی بری طرح کھٹک رہی تھی۔ کرشن داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ پہلی بار ان کی بیوی بھی تھیں۔ پہلی بار کرشن دیر سے آئے اور "دیر کی وجہ" منہ پھلائے نہایت قہر آلود نظروں سے چاروں طرف دیکھتی رہیں، پھر پلٹ کر جانے کا فیصلہ کیا، کرشن کی آنکھوں میں کرب جھلکنے لگا۔ اندر اور باہر کے درمیان معلق ہو کر رہ گئے، مگر ہم نے جلدی سے دونوں کو پکڑ کر بٹھا دیا۔ کرشن نے ایک لمبی سانس کھینچی اور بیٹھ گئے۔

جب میٹنگ ختم ہوئی تو دونوں غائب تھے، نہ جانے کب سٹک گئے۔

"ضرور دونوں میں لڑائی ہوئی ہوگی!" میں جو لڑنے میں مشاق ہوں فوراً تاڑ گئی۔

"کہیں اور جانا ہوگا!" عباس نے رائے دی۔

"بیچاری بور ہو رہی ہوں گی۔" شاہد نے پہچان لیا۔

دوسرے دن کرشن آئے تو ہم ان کے پیچھے پڑ گئے کہ ہم تمہارے گھر آئیں گے۔

کرشن گم سم رہ گئے، ان کی حساس آنکھیں کچھ دھندلی سی ہو گئیں۔

"اور کھانا بھی تمہارے یہاں کھائیں گے۔" شاہد نے زور دیا۔

"ضرور!" کرشن نے مری ہوئی آواز میں کہا اور جلدی سے عباس کی طرف چلے گئے۔

"جانا ٹھیک نہیں!" شاہد نے کہا۔

"کیوں؟"

"پتہ نہیں کیا بات ہے، کرشن اکھڑے اکھڑے لگ رہے ہیں۔"

"کچھ نہیں بیوی سے لڑائی ہو گئی ہو گی۔"

"ایسا ہی لگتا ہے۔"

"مگر ہمارے سامنے نہیں لڑیں گے۔ چلو اسی بہانے ملاپ ہو جائے گا۔"

ہمارے یہاں یہی حال تھا۔ زور و شور کی لڑائی ہو رہی ہوتی۔ کوئی مہمان آجاتا، ہم دونوں فوراً چولا بدل کر نہایت خوش اخلاق بن جاتے اور یہ تک بھول جاتے کہ کس بات پر لڑائی ہو رہی تھی۔ فوراً تاش شروع ہو جاتے یا مہمانوں کو لیکر کسی ہوٹل میں محفل جم جاتی۔ ہم نے سوچا چلو کرشن کی لڑائی ختم کرا دیں۔

کرشن اس زمانے میں ورسووا میں ایک اجڑے ہوئے لق و دق مکان میں رہتے تھے ہم ایک بڑے سے ڈھنڈار ہال میں پہنچے، کمرے کے بیچوں بیچ ایک ٹوٹا ہوا صوفہ پڑا تھا۔ دیوار سے لگی دو لمبی لمبی چارپائیاں کھڑی تھیں۔ صوفہ پر دو میلی کچیلی لڑکیاں ایکدوسرے کے بال کھسوٹ رہی تھیں۔ ایک بچہ ایک اونچی سی قمیض پہنے لکڑی سے دونوں کو

پیٹ رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر بچے سکتے میں رہ گئے۔ ہم نے بہت پکارا بات تو سنو مگر بچے روتے بسورتے سرپٹ بھاگے۔ چھوٹے بچے کی تو گھگی بندھ گئی۔ جیسے اس نے کوئی ہوّا دیکھ لیا ہو۔

ہم نے صوفہ سیٹ پر بیٹھنے کی کوشش کی تو ایک اسپرنگ سانپ کی طرح پھن کاڑھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ارے بھئی کوئی ہے؟" شاہد نے ہانک لگائی۔

بائیں جانب کے دروازے سے کرشن نکلے۔ اور دہلیز پر کھڑے ہو کر سر کھجانے لگے۔ پھر بولے۔

"ارے!"

جی جل کر خاک ہو گیا۔

"ارے بھئی ہم آئے ہیں!" ہم نے معذرت کی۔

دائیں جانب ایک دروازہ کھلا اور مہندر ناتھ ظاہر ہوئے۔

"اوہو" انہوں نے سٹپٹا کر کہا۔

ہم چاروں تھوڑی دیر احمقوں کی طرح کھڑے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے۔

"ادھر آجاؤ" کرشن نے ایکدم فیصلہ کیا اور ہمیں اپنے کمرے میں لے گئے۔ کمرہ نہایت چھوٹا مگر بڑا صاف ستھرا اور خوبصورت تھا۔ اس کھنڈر میں وہ کمرہ نگینہ کی طرح جگمگا رہا تھا۔ مختصر سا پلنگ معمولی سا زمین پر فرش معلوم ہوتا تھا کسی زمانہ میں غسلخانہ ہوا کرتا تھا

کرشن نے اسے اپنا لکھنے کا کمرہ بنا لیا، ہم نے زیادہ وقت اسی میں گزارا ذرا بھی تنگی یا الجھن نہیں محسوس ہوئی۔ کرشن کا وجود خود ایک وسعت تھا۔

"بیگم کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ادھر ہوں گی۔" کرشن نے ٹال دیا۔

کچھ ہم ایسے صبح تڑکے بھی نہیں آئے تھے، نہ بے اطلاع آئے تھے۔ بارہ بجنے والے تھے، سمجھ میں نہیں آیا کیا قصہ ہے۔ کرشن اور مہندر ناتھ کچھ بے چین سے تھے۔

"چلیں" شاہد نے چپکے سے پوچھا۔

"نہیں نہیں، اماں یار بیٹھو بھی۔"

پھر زبانیں کھل گئیں، دل کھل گئے، ساری گھٹن مٹ گئی۔ مختلف کہانیوں کا ذکر چھڑ گیا، منٹو کی یاد ستانے لگی۔ میں پلنگ پر لیٹ گئی۔ شاہد فرش پر پھسکڑا مار سگرٹیں بنا بنا کر بانٹنے لگے۔ مہندر ناتھ میز پر پالتی مار کر بیٹھ گئے کرشن کرسی پر ایک پیر لٹکائے بیٹھے تھے۔ وقت اڑ رہا تھا۔

"ارے!" میں تو باتوں کے سلسلہ کو توڑ کر اٹھ بیٹھی۔

"کیا ہوا؟" کرشن چونکے۔

"تمہاری بیوی!"

"اوہ" انہوں نے دوسرا پیر بھی کرسی پر جما لیا۔

"کہاں ہیں؟"

"اِدھر ہوں گی!" کرشن نے ٹالا۔

"ادھر کدھر؟" انھیں شاید ہمارے آنے کا پتہ بھی نہیں، کیا سوچیں گی۔"

سوچنے کے لفظ پر کرشن مسکرائے، مہندر ناتھ کھنکارنے لگے۔

"میں جاکر انہیں ڈھونڈتی ہوں۔" میں نے ہال میں جھانکا کوئی نہ تھا۔ برآمدے میں کوئی نہ تھا۔ سناٹا چھایا ہوا تھا۔ یا خدا یہ بیچے کہاں گئے؟ سیڑھیوں سے اتر کر میں نے بنگلے کا چکر لگانا شروع کیا۔ پچھواڑے کے چبوترے پر وہ کھڑی کپڑے پھیلا رہی تھیں انہوں نے میرے آر پار دیکھا اور کپڑے پھیلاتی رہیں۔

"نمستے!" میں نے نہایت ڈھٹائی سے قریب جاکر کہا۔

انہوں نے سر کی جنبش سے میرا سلام وصول کیا اور سیڑھیاں اتر کے غائب ہو گئیں میں سمجھ میں نہیں آیا کیا قصہ ہے۔ کس بات پہ خفا ہیں۔ میں واپس کرشن کے کمرے میں لوٹ آئی۔

"ملیں؟" شاید نے پوچھا۔

"ملیں تو نہیں، دکھائی ضرور دیں پھر غائب ہو گئیں، فلم 'محل' کی ہیروئن کی طرح۔"

"اوہ!" کرشن سر کھجانے لگے، بڑے انہماک سے۔

"کوئی بات نہیں پھر مل جائیں گی، آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟"

"کیا کچھ ہم سے خفا ہیں؟"

کرشن باہر گئے تو مہندر نے چپکے سے کہا۔ "وہ دنیا سے خفا ہیں۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ دنیا کرشن جی کو چاہتی ہے۔"

"وہ خود بھی تو کرشن جی کو چاہتی ہوں گی۔"

"اسی لیے تو وہ سمجھتی ہیں کہ دنیا کی ہر لڑکی کرشن جی پر مرتی ہے۔ اور ان کی سوت ہے۔"

"اے ہے بیچاری بڑی بھولی ہیں۔"

عورت کا میاں ہوتا ہے، بچے ہوتے ہیں، اگر میاں کا بٹوارہ ہو جائے تو وہ سہم جاتی ہے، خود اس کی ذات میں اپنا کچھ نہیں ہوتا۔ وہ اپنے بٹوارے سے بھی خائف ہو جاتی ہے۔ میاں اگر عوام کی جاگیر بن جائے اور بچے بڑے ہو جائیں تو وہ خالی ہاتھ رہ جاتی ہے۔ اس دن کے لیے وہ لرزتی رہتی ہے، خود اعتمادی ختم ہو جاتی ہے، جو بھی حصہ بٹانے آتا ہے۔ اس سے سوتیا ڈاہ پیدا ہو جاتا ہے۔

"کرشن ڈیڑھ بج رہا ہے!" شاہد بولے۔

"نہیں ابھی تین منٹ باقی ہیں۔" کرشن گھڑی دیکھ کر بولے۔ "کیا بھوک لگ رہی ہے؟"

"نہیں تو۔" میں نے جھوٹ بولا۔ اتنے میں اور بیرا آگیا، باتیں چل نکلیں۔ معلوم ہوا بیدی بھی آجکل یہیں ہیں۔ اور قریب ہی رہتے ہیں۔ ہم نے سوچا چلو بیدی سے مل آئیں کھانا تیار ہوتا نظر نہیں آتا۔ کرشن سے پتہ پوچھ کر بیدی کے یہاں پہنچے۔

"سنا ہے بڑی گندی کہانیاں لکھتی ہو!" بیدی کی بیوی نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"مکھنی تو بڑی صاف ستھری ہیں پر نہ جانے کیسے گندی ہو جاتی ہیں۔"

"مت لکھا کرو جی!"

"تم کہتی ہو تو نہیں لکھوں گی۔" میں نے بات ٹالی۔ کرشن کی بیوی کا ذکر کیا۔

"ارے وہ تو میری چھوٹی ہے۔ میں اسے بیاہ کر لائی ہوں۔"

"تو چلو مجھے ان سے ملوا دو۔ کھانا بھی وہیں کھا لیں۔"

"کھانا تو ہم کھا چکے ہیں۔"

"تو چلو۔"

بیدی کی بیوی نے چھوٹتے ہی انہیں پنجابی میں میٹھی میٹھی گالیاں دیں۔ ان کے چہرے کا رنگ ایک دم بدل گیا۔ واقعی مسکرانے لگیں۔ فوراً اپنے کمرے میں لے گئیں۔ دروازے پر من بھر کا تالا پڑا تھا۔ اندر تین پلنگ گچھ پچ بچھے ہوئے تھے جن پر نہایت میلا گودڑ پھیلا ہوا تھا۔ سب کھڑکیاں ٹھوس تھیں۔ ایک بھی شیشہ نہ تھا۔ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ تلے اوپر بہت سے صندوق رکھے تھے۔ جن میں بڑے بڑے تالے لٹک رہے تھے۔ کمرہ دکھا کر فوراً باہر نکل آئیں اور تالہ ڈال دیا۔

"کھانا آ گیا۔" انہوں نے پہلا اور آخری جملہ بولا اور ہمیں چھوڑ کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئیں۔

مسز بیدی پنجابی میں خوب بڑبڑائیں۔

کھانا کرشن کے کمرے ہی میں لگ گیا۔ کسی اچھے ہوٹل سے آیا تھا مرغ، شامی

کباب، بریانی اور پڈنگ

"بیوی کو نہیں بلاؤ گے؟" میں نے کرشن سے پوچھا۔

"انہوں نے بچوں کے ساتھ کھا لیا۔"

تو یہ تھی میری کرشن کی بیوی سے ملاقات۔ وہ نہ گونگی تھیں نہ بہری۔ مگر نہ جانے زندگی کے کون سے تاریک دور سے گذر رہی تھیں۔ وہ کسی سے نہیں ملتی تھیں نہ کہیں نہیں جاتی تھیں۔ ایک خود ساختہ قید بھگت رہی تھیں۔ وہ جاہل نہیں بی۔ اے پاس تھیں۔

دوسرے دن کرشن چندر آئے ان کے چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں میں پریاں ناچ رہی تھیں۔ بڑے خوش تھے۔ جیسے میری فاختہ اڑا دی ہو۔

"کیا فضا ہے تمہارے گھر کی؟" میں نے جل کر کہا۔

"شامی کباب کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔"

"تمہیں گھٹن نہیں ہوتی؟"

"لیکن اگر گلاوٹ کے کباب ہیں، تو تھوڑی پودینے کی چٹنی پسوا لینا۔"

"بڑے ڈھیٹ ہو!"

"تب ہی تو زندہ ہوں۔"

بہت دن تک کرشن رہے۔ میٹنگیں وغیرہ بند تھیں۔ ایک دن اچانک آ گئے۔ آتے ہی صوفے پر ڈھے گئے۔

لال آنکھیں، ماتھے پر زخم، ہاتھ میں پٹی بندھی ہوئی۔

"بس میں چکر آنے لگے، اس لیے یہاں اتر گیا۔"

"یار تجھے تو بخار ہے!" شاہد نے ماتھا چھو کر کہا، دیوان پر لٹا دیا۔ میں نے رضائی لا

اڑا دی۔ تھرمامیٹر لگایا تو ایک سو چار ڈگری بخار!

"کیا کہیں گر پڑے؟"

"غصہ ہوا ٹھوکر کھائے۔"

"چوٹ؟"

"یہ چوٹیں اکثر ابھرتی رہتی ہیں۔"

"سو نے دو بیچارے کو۔" شاہد نے پردے کھینچ دیے۔

آنسو میری کنپٹیوں میں اُبلے جھلتے رہے۔ مجھے غصہ آرہا تھا۔ نہ جانے کس پر!

ان دنوں کرشن بڑے زناٹے سے لکھ رہے تھے۔ ہر رسالہ میں ان کی کہانیاں چھپ

رہی تھیں۔

اردو کے بیشتر رسالے پاکستان کی طرف کٹ گئے تھے۔ یہاں کے رسالے دم توڑ

رہے تھے۔ کرشن نے "شمع" اور "بیسویں صدی" میں بڑی پابندی سے لکھنا شروع کر دیا

تھا۔

شام کو دیکھا تو بخار نارمل سے بھی نیچے تھا کرشن گھر جانے پر مصر تھے۔ ہم لوگ کہہ رہے

تھے، رات کو یہیں سو جاؤ۔ مگر وہ ضد کرنے لگے۔

"چلو ہم لوگ پھوڑ آئیں۔" شاید کپڑے بدلنے چلے گئے۔

"کرشن تمہارے پاس تین گاڑیاں تھیں کیا ہوئیں؟" میں نے پوچھا۔

"گئیں۔" انہوں نے ہاتھ ہلایا، جیسے چڑیاں اڑانے جا رہے ہوں۔

"کہاں گئیں؟"

"ایک بیوی کلی نے بیچ لی۔"

"دوسری؟"

"دوسری قرض خواہ لے گیا۔"

"اور تیسری؟"

"تیسری وہ لے گئی۔"

"وہ کون؟"

"وہی!"

"تمہاری محبوبہ دل نواز؟"

"ہاں۔"

"عجب گھونچو ہو۔"

"اس میں کیا شک ہے!"

"مگر وہ تو تم پر عاشق تھی۔"

"گاڑی پر مجھ سے زیادہ عاشق تھی۔"

جب انہیں پہنچانے گئے تو گھر سے دور سڑک پر ہی موٹر رکوالی۔

"بس یہیں اتار دو۔"

"کیوں؟"

"بس اتار دو، میں چلا جاؤں گا۔" انہوں نے سیما کے گال کو ہاتھ لگایا اور تیز قدم بڑھ گئے۔

مَیں نے خود نہیں کی ڈر لگا کہ کہیں دوسری کھیتی بھی زخمی نہ ہو جائے

ایک دن عجیب حلیہ سے چلے آ رہے ہیں۔ اندر آئے تو سڑاند کا ایک بھبکا بھی ساتھ داخل ہوا۔

"عباس گھر پر نہیں!" معذرت پیش کی۔

"عباس اور ممی کسی فلم کے پریمیئر میں گئے ہیں بیٹھو۔"

"شاہد کا ایک کرتہ پاجامہ مل جائے گا۔ اور تھوڑا سا پانی!"

"یہ تھوڑے سے پانی کے بس کی بات نہیں معلوم ہوتی۔ کیا آج موری میں پھسل پڑے؟"

میں نے صاف کپڑے گرم پانی اور تولیہ غسلخانہ میں رکھوا دیا۔ نہا کر نکلے تو شاہد آگئے اور شغل شروع ہو گیا۔ کرشن نے اس دن کچھ نہیں بتایا۔ ایک دن مہندر ناتھ ملے تو کہنے لگے کرشن اکثر فٹ پاتھ پر شب گذاری کیا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی کئی دن کے لیے غائب ہو جاتے۔ وہاں زمانہ بھر کے قسمت کے ستائے انسانوں میں گھل مل کر ان کا درد اپنے دل میں سمو لیتے ہیں۔ وہاں کسی کو نہیں معلوم ہوتا کہ کون ہیں کیا کرتے ہیں۔ وہاں سے کھانسی

بخار لے کر لوٹتے ہیں اور بیوی سمجھتی ہے وہ کسی محبوبۂ دل نواز کے پہلو میں دادِ عیش دے رہے ہوں گے حالانکہ ان کی سب سے بڑی محبوبہ ان کی افسانہ نگاری ہے۔ جس کی لگن میں انہیں تن بدن کا ہوش نہیں رہتا۔

پھر باون[۵۲] ترپن[۵۳] میں جب ہم لوگ چرچ گیٹ آگئے تو اس وقت ترقی پسند تحریک بڑے نازک دور سے گذر رہی تھی۔ ایک دھارا تھا جو پوری شدت اور جلال سے بہہ رہا تھا۔ بیچ میں چند ناقابلِ عبور چٹانوں کے آجانے سے ٹکڑے ٹکڑے بٹ کر اِدھر اُدھر بکھرنے لگا۔ ملنے جلنے کے ذرائع کٹ گئے۔ کبھی یونہی کسی بہانے سے مجروح، سردار جعفری یا عباس کے ہاں مل بیٹھتے اور وقت گلوں شکوؤں میں کٹ جاتا۔ کوئی ادبی سوال نہ اٹھتا، بس شکوہ شکایت پر بات ختم ہو جاتی۔

اڑتالیس[۴۸] انچاس[۴۹] میں جو ادیب اور شاعر جیلوں میں ٹھونسے گئے تھے، جب ہی سے تحریک میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ جو اور واضح ہوتی گئیں۔ تحریک نے ہمیں ملایا تھا۔ اور اسی نے بکھیرنا شروع کر دیا۔ ذاتی دوستیوں اور پیار کا رشتہ قائم تھا۔ مگر وہ بھی دن بدن ڈھیلا پڑتا جا رہا تھا۔ وہ بات ختم ہو گئی تھی جو کسی زمانہ میں تھی۔

چھپن[۵۶] میں شاہد ایک فلم فلمستان کے لیے ڈائریکٹ کر رہے تھے۔ اس کا اسکرپٹ کرشن لکھ رہے تھے۔ فلم بڑی ڈھیلی چال چل رہی تھی۔ اس زمانے میں کرشن اکثر شاہد کے ساتھ اسٹوڈیو سے آجایا کرتے تھے۔

ایک دن کرشن آئے اور شاہد کے لوٹنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک دم بولے:-

"میری کہانی سنو گی؟"

میں دنگ رہ گئی۔

کرشن بڑے موڈ میں تھے، پلنگ پر پالتی مار کر بیٹھ گئے، اور ایک چھوڑ اپنی چار کہانیاں سنا ڈالیں۔ یہ کہانیاں انہوں نے قلم برداشتہ عجیب موڈ میں لکھی تھیں۔ مجھے ان کے نام بھی یاد نہ رہے۔ اور یہ بھی پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں چھپیں۔ یہ علامتی کہانیاں تھیں۔ اس وقت جدید کہانی کا زور نہیں تھا، بلکہ میں نے تو علامتی کہانیاں کرشن ہی کی سنی۔ ان میں کرشن کے قلم کی تمام وسعت بھرپور انداز میں جلوہ گر تھی۔ اس کے بعد انہوں نے ایسی کہانیاں پھر نہیں لکھیں۔

ایک دن مہندر ناتھ آئے۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے۔ کرشن ورسووا میں نہیں رہتے ان کے ساتھ دادر رہتے ہیں۔

"اس چھوٹے سے کمرے میں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں وہ کمرے میں نہیں رہتے کہ ہمیں تکلیف ہوگی۔ زینہ کے پاس تھوڑی جگہ ہے۔ وہیں کھاٹ ڈال لی ہے۔"

"بڑی تکلیف ہوتی ہوگی۔"

"وہ رہتے کہاں ہیں، نہ جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرتے ہیں۔ رات کو بارہ ایک بجے آکر پڑ جاتے ہیں۔ صبح میں اپنے کام سے نکل جاتا ہوں، وہ وہیں کھاٹ پر بیٹھے لکھتے رہتے ہیں۔ شام کو پھر نکل جاتے ہیں۔ انہیں سمندر سے عشق ہے۔ گھنٹوں

ریت پر بیٹھے لہریں گنا کرتے ہیں۔ جی ہی نہیں بھرتا۔"

ایک دن میں اور جمیلہ مجیب کلابہ کے بازار میں یوں ہی جھک مار رہے تھے کہ اچانک فٹ پاتھ پر کرشن اور سلمیٰ صدیقی سے ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔ کرشن کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں، جیسے کسی نے انہیں لڈّو چراتے پکڑ لیا ہو۔ مگر ہم دونوں سلمیٰ سے گلے ملنے میں مشغول تھے۔ فوراً گدڑا کر جمیلہ نے دونوں کو گاڑی میں بٹھا لیا۔ اور کف پریڈ ڈاکٹر حمید کے ہاں لی گئیں۔ اس سے پہلے کہ کرشن چندر اور سلمیٰ کچھ بولتے انہیں مسٹر اور مسز کرشن چندر کہہ کر ملوا دیا۔ دونوں دم سادھے بیٹھے رہے۔

کرشن کف پریڈ کی ٹیرس پر کھڑے سامنے پھیلے ہوئے سمندر کی طرف کھوئی کھوئی نظروں سے کچھ ڈھونڈ رہے تھے۔

"چلیے گا نہیں!" سلمیٰ نے چپکے سے پوچھا اور وہ چونک پڑے۔

"چلو ہم تمہیں پہنچا آئیں۔"

"ہم چلے جائیں گے۔" سلمیٰ نے ٹالا۔

"کہاں رہ رہی ہو۔" میں نے چپکے سے پوچھا۔

"ہوٹل سی فیس میں۔"

"میرے گھر سے دو قدم پر ہے چلو۔"

ہوٹل کے پچھلے حصّے کے سستے کمرے میں پہنچ کر میں نے پوچھا۔

"یہاں کب تک رہوگی؟"

"کیا کریں یہاں مکان ملتا ہی نہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہار گئے۔"

میرے پاس ایک کمرہ ہے۔ جبتک مکان ڈھونڈو میرے ساتھ رہ لو۔"

تھوڑے سے تکلّف کے بعد سلمٰی اور کرشن میرے ہاں آگئے، سارا دن مکان کے چکر میں گھومتے پھر کہیں پیر ٹکانے کا سہارا ہوگیا اور وہ چلے گئے۔ سلمٰی اپنی نوکری سنبھالنے علی گڑھ چلی گئی۔ کرشن پھر خانہ بدوشوں کی سی زندگی گذارنے لگے، شاہد کے فلم کا کام چل رہا تھا۔ اکثر کرشن شام کو ساتھ آجاتے۔ فلم کا کام کم اِدھر اُدھر کی باتیں زیادہ ہوا کرتیں۔ آخری ٹرین سے کرشن چلے جاتے۔ کبھی بے خیالی میں آخری ٹرین نکل جاتی، تو وہ دیوان پر سو جاتے، صبح پہلی ٹرین پکڑ لیتے۔

جملہ پریشانیوں کے باوجود ان کا قلم موتی پرو رہا تھا۔ بڑی شدت سے لکھ رہے تھے۔ جسمانی دکھوں نے ذہن پر اور بھی دھار رکھ دی تھی۔ ان کی تحریروں میں رومانیت کم ہوتی جارہی تھی، طنز بڑی شدت سے ابھر رہا تھا۔

"یہ سلمٰی اور کرشن کا کیا قصہ ہے۔" ایک دن شاہد نے پوچھا۔

"شادی ہوگئی ہے۔"

"کب ہوئی؟"

"پچھلے نومبر میں جب علی گڑھ اور دہلی گئی تھی۔ میرے اور جمیلہ کے سامنے۔" شاہد مطمئن ہو گئے۔

میں نے سلمٰی اور کرشن کی آنکھوں میں شادی سے کہیں زیادہ مقدس جذبہ دیکھا تھا۔

زیادہ پائیدار اور پرخلوص۔ ایک دوسرے کے لیے دیوانگی کی حدوں کو چھوتا ہوا عشق۔ شادی حرف مذہب کے ٹھیکیداروں کے دو بولوں کا نام نہیں بلکہ دوستی اور ایک دوسرے میں کچھ پا لینا ہی شادی ہے۔ اس میں دنیاداری کو دخل نہیں ہوتا بغیر کسی ہنگامے کے ایسی شادیاں ہوتی ہیں۔ اور باوجود مادی مخالفتوں کے ذہنی یکسوئی کا باعث بن جاتی ہیں۔ شاہد کی فلم ختم ہو گئی اور کرشن غائب ہو گئے۔ رشتے جو ترقی پسند تحریک نے جوڑے تھے بکھرتے جا رہے تھے۔ سردار جعفری اور سلطانہ کے علاوہ سب ہی باندرہ اور جوہو کی طرف کھسک گئے تھے۔ کبھی کوئی بہانہ نکال کر اب بھی سب مل بیٹھتے تھے۔ کبھی مجروح کے ہاں شکیلا بانو بھوپالی کا گانا سننے کے بہانے، کبھی راجندر سنگھ بیدی کے یہاں شادی کے سلسلہ میں، کبھی عباس کو ہارٹ اٹیک ہوا تو ان کے ہاں مجمع ہو جاتا۔ خاص طور پر جب سجاد ظہیر آتے تو سوئی ہوئی حسین یادیں جاگ اٹھتیں۔ ترقی پسندوں کی انجمن میں کچھ جان ڈالی جاتی۔ اور بھرے بیتے ہوئے دنوں کی پرچھائیاں اُبھر آتیں۔

افرو ایشین کانفرنس کے سلسلہ میں سردار، عباس، ساحر مجروح کے ساتھ دہلی جانا ہوا تو ہمیں نہیں معلوم تھا کہ کہاں ٹھہریں گے۔ اسٹیشن پر سب بانٹ لیے گئے میں کرشن چندر کے حصہ میں آئی۔

"ارے تم یہاں ہو، ہم تو تمہیں گم شدہ سمجھ کر رو بیٹھے تھے۔"

"زندگی میں پہلی بار خود کو پایا ہے!" کرشن نے چپکے سے کہا۔

سلمیٰ بڑے پیار سے ملی تھیں۔ میں نے ایک دفعہ اور بھی کرشن کا ایک گھر دیکھا تھا۔ بھوت

بنگلہ، وہی والا گھر نہایت سگھڑاپے سے سجایا ہوا تھا۔ عمدہ فرنیچر، بیش قیمت پردے ڈائننگ روم، ڈرائنگ روم اور کشادہ بیڈ روم، آنگن میں پھولوں کے پودے اور پام کے گملے۔ کرشن اس گھر میں کچھ مہمان سے لگ رہے تھے۔

مگر ان کے چہرے پر سکون اور بشاشت تھی، کپڑے پھر نہایت صاف ستھرے، جیسے میں نے ان کے جسم پر سن چالیس میں پہلی بار دیکھے تھے۔ ان کے چہرے سے بے سروسامانی کی پرچھائیاں مٹ چکی تھیں۔ آنکھوں میں پرسکون ٹھہراؤ پیدا ہو گیا، ہر دم ان کی جذبات سے ابر تر آنکھیں سلمیٰ کے اردگرد منڈلایا کرتیں۔ انہوں نے خود کو مکمل طور پر سلمیٰ کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ انہیں جو کھلاتی کھا لیتے۔ سلمیٰ کی چرب زبانی کا اثر ان کی باتوں میں جھلکنے لگا تھا۔

"کیا کہیں سے قارون کا خزانہ مل گیا؟" میں نے چپکے سے پوچھا۔

"سلمیٰ جانے وہی سب خرچ اٹھاتی ہے۔"

"سلمیٰ کی جمع پونجی کتنے دن چلے گی؟"

"بس اب ختم ہونے والی ہے!"

"پھر؟"

"پھر سلمیٰ علیگڑھ جا کر نوکری سنبھال لے گی اور ہم وہی اپنے اڈے پر بمبئی۔"

"یہ بھی کوئی زندگی ہوئی؟"

"جو لمحے مل جائیں وہی اپنے ہیں۔"

"کل کی فکر ہے؟"

"قطعی نہیں!"

میں نے پہلی بار کرشن کو لکھنؤ کا کڑھا ہوا آستین چنا کرتا دیکھا۔ وہ کوئی چھوٹے موٹے نواب لگ رہے تھے۔

کھانے کی میز پر کوئی دس آدمیوں کا کھانا سجا ہوا تھا۔ کوئی مہمان نہیں آنے والا تھا۔ اور مجھے برسوں پہلے کا وہ ہوٹل کا کھانا یاد آگیا جو میں نے پہلی بار درسوا والے گھر میں تین بجے کھایا تھا۔

ایک دن کانفرنس ہال سے نکلے تو کرشن جا چکے تھے۔ مجروح نے کہا ہم پہنچا دیں گے۔ مگر ذرا لوفنگ کی جائے گاڑی میں بھر کے ہم لوگ دہلی کی سڑکوں پر گھومتے رہے۔ جامع مسجد سے نان کباب اور کچھ مٹھائی خریدی سوچا چل کر کرشن چندر کے گھر کھائیں گے۔

مجروح، فردوس، سلطانہ، سردار اور ساحر کے ساتھ رات کے پونے بجے کرشن کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون ہے؟" کرشن سوئی ہوئی آواز میں بولے۔

"تمہاری بیوی!"

کرشن دروازہ کھول چکے تھے ایک دم بوکھلا کر دونوں ہاتھوں سے دروازہ بند کر دیا۔ ہم قہقہے اڑانے لگے۔ جھینپتے ہوئے انہوں نے دروازہ کھولا ان کا چہرہ سفید ہو رہا

تھا۔ ہاتھ کانپ رہے تھے، سلمیٰ کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ اور ماتھے سے پسینہ پونچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ کرشن نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر اس کا آنچل مٹھی میں دبا لیا۔

ہم ایسا بھونڈا مذاق کر کے پچھتا رہے تھے۔ ایک نام میں کیا جادو تھا کہ دونوں مفلوج ہو گئے۔ جیسے انہوں نے کوئی بہت بڑا گناہ کر ڈالا ہو۔۔۔

کرشن نے ہمیشہ دو محبت کرنے والے دلوں کی اپنی تحریر میں ستائش کی۔ ان کی کہانیاں پکار پکار کر انسان کے لیے جینے کا حق مانگتی ہیں۔ انہوں نے پیار بھرے دلوں کا درد اپنی ہستی میں سمو لیا تھا۔ اور خود چپ رہتے بیٹھے تھے۔ جیسے انہیں جینے کا حق نہیں تھا۔ وہ کولہو کے بیل تھے۔ ان کی گردن پر جوا رکھا تھا۔ اسے اتار پھینکنے کا حق نہیں تھا۔ مگر کرشن زندگی کے عجیب موڑ پر ایک سرپھری سے دیوانوں جیسا پیار کر بیٹھے تھے۔ جملہ پابندیوں میں زندگی گزارنے کے بعد بھی اس میں جھوٹے بندھن توڑ دینے کی ہمت تھی۔ کرشن کے سوا اسے کوئی نظر نہ آتا تھا۔ سوائے کرشن کی پکار کے ہر آواز کے لیے اس کے دل و دماغ کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ اس نے اپنے والدین کا والہانہ عشق دیکھا تھا۔ اور زندگی سے ویسا ہی انعام چاہا تھا۔ محبت جو ایک جادو ہے، جس کے عدم اور وجود پر کسی کا اجارہ نہیں ہو سکتا کوئی راہ فرار نہیں ہوتی ۔۔۔ مگر ہاتھ بڑھا کر جام اٹھانے کی ہمت بہت کم ہوتی ہے۔

سلمیٰ کا وجود کرشن کو خوب راس آیا۔ ان کی زندگی کا ڈھانچہ ہی بدل گیا۔ ساحر، بیدی اور مجروح کے مرتبہ پر پہنچ گئے۔ میرا مطلب ہے مالی طور پر۔ موٹر بھی خریدلی گو زیادہ دن نہیں

چلی. مگر خرچہ شاہانہ ہی رہا۔ ان کی مقبولیت عوام سے بڑھ کر خواص تک پہنچ گئی۔ وہ جنہوں نے انہیں پڑھا بھی نہیں تھا ان پر بھی دھاک بیٹھ گئی۔ ان کی مقبولیت کو چار چاند لگ گئے۔ پاکستان میں ان کی مقبولیت اور شہرت بڑھتی گئی۔ وہاں منٹو کی بے قدری ہوئی ہو لیکن کرشن اردو ادب پر چھائے ہوئے ہیں۔ روسی اور دوسری زبانوں میں ان کی مقبولیت پھیل گئی۔ پاکستان کے ایک رسالے نے تو باقاعدہ کرشن کے بارے میں رائے عامہ جمع کر کے ایک نمبر مرتب کیا اور ثابت کر دیا کہ کرشن چندر برِّصغیر کے مقبول ترین اور سب سے بلند مصنف ہیں۔

عموماً ہر طبقہ کے لوگ ان کی عظمت کے قائل تھے، مگر ادھر چند سالوں سے کچھ لوگ سوچنے لگے تھے کہ کرشن چندر عوامی دھارے سے کٹتے جا رہے ہیں۔ کسی میں کھل کر کہنے کی ہمت تو نہ ہوئی، لیکن سرگوشیاں ہوتی تھیں کہ کرشن کو اونچے طبقے نے لپک لیا ہے۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا لکھ پتیوں اور منسٹروں تک محدود ہو گیا ہے۔ حسبِ دستور ان کی تحریریں نہلے پہ دہلا نہیں ثابت ہو رہی ہیں کبھی کبھی تو پنجہ جھک کر پڑ جاتا ہے۔ وہ اب بھی عوامی ادب تخلیق کر رہے ہیں، لیکن اس میں صداقت کی دھار کند نظر آتی ہے۔ وقت کی پکار ماند پڑتی جا رہی ہے وہ قدرت پانا پر فرشتے دیکھنے لگے ہیں۔ ان کا مجبور اور کچلا ہوا ہیرو فلسفی بن کر ذہنی خلا میں بھرنے لگا ہے۔ وہ سوچنے لگے ہیں کہ غربت اور ناانصافی انسانیت کا خون نہیں کرتی بلکہ بلند مرتبہ پر پہنچا دیتی ہے۔ جہاں وہ ایک عظیم مفکر اور وسیع الدماغ فلسفی بن جاتا ہے گویا یہ سرمایہ داری نظام ایک نعمت ہے۔ وہ جس ٹھاٹھ باٹھ سے خود رہتے ہیں، اسی انداز سے رہنے والوں پر جب چوٹیں کرتے ہیں۔

تو کھو کھلے ڈبے جیسی آواز نکلتی ہے۔ ان کی تحریروں میں مزاح کی چاشنی بڑھتی جا رہی ہے۔ اب "ان داتا" "مہا لکشمی کا پل" اور "کالو بھنگی" جیسی دھار دار حقیقت نہیں جھلکتی۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ادیب کے لیے لازمی ہے کہ وہ مفلسی اور قلاشی میں زندگی گذارے تب ہی وہ اعلیٰ درجے کا عوامی ادب تخلیق کر سکتا ہے۔ اگر اس قول میں ذرہ بھر بھی سچائی ہوتی تو دنیا کے کروڑوں مجبور اور لاچار کرشن چندر بن گئے ہوتے۔

حقیقت یہ تھی کہ جب سے کرشن پر دل کا دورہ پڑا تھا ان کا زندہ رہ جانا ایک معجزہ تھا۔ ڈاکٹروں نے انہیں منع کر دیا تھا کہ بوجھل قسم کی دماغی محنت سے بچیں۔ بھاری بھر کم غم اور یاس سے بھرے موضوع کی شدت وہ برداشت نہیں کر سکیں گے۔

یہ تو لکھنے والے ہی جانتے ہیں کہ لکھتے وقت ادیب کن راہوں سے گذرتا ہے۔ اس کے دل و دماغ پر کیا بیتتی ہے کرشن پر پابندیاں لگ چکی تھیں پھر بھی نہ وہ لکھنا چھوڑ سکے نہ اخباروں اور رسالوں نے انہیں دم لینے دیا۔ وہ بیماری کے بعد بھی لکھتے رہے۔ کرشن کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ لکھنا بند نہیں کر سکتے تھے۔

ایک دفعہ جب وہ بیماری کی حالت میں تھے تب دیکھنے گئی۔ ان پر غنودگی طاری تھی۔ مگر ان کا دایاں ہاتھ متحرک تھا۔ ان جانے میں رواں دواں تھا۔ جیسے خلاء میں پرواز کر رہا ہو۔ کچھ سوچ رہا ہو۔

کرشن کہا کرتے تھے "جب میں لکھتا ہوں تو میرا دماغ انگلیوں میں اتر آتا ہے۔ قلم انگلیوں کی گرفت میں آتے ہی میرا دماغ اڑنے لگتا ہے۔"

لیکن سلمیٰ کا بس چلتا تو وہ ان کی سوچ پر تالے ڈال دیتی۔ جس دن سے ان پر دل کا دورہ پڑا سلمیٰ نے انہیں روئی کے گالوں پر پالنا شروع کیا۔ کرشن بچوں کی طرح بد پرہیزیاں کرتے اور سلمیٰ پر کرب طاری ہو جاتا۔

پرستاروں کی دعائیں، دھن والوں کی دریا دلی اور سلمیٰ کی جانفشانی اور بھاگ دوڑ نے کرشن کو نئی زندگی بخشی اور وہ پھر سے میدان عمل میں اسی شدت سے سرگرم ہو گئے کہ ہر ادبی تحریک ان کے بغیر نامکمل تھی۔

فلموں میں وہ زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔ اپنے دو فلم بنا کر وہ اس لائن سے مایوس ہو چکے تھے۔ اس عرصے میں ان کا خرچ بہت بڑھ گیا تھا۔ طرز زندگی بدل گیا تھا۔ اس شاہانہ خرچ کو چلانے کے لیے وہ فلموں کا کام کرتے رہے۔

کرشن سے میری آخری تفصیلی اور بے تکلف ملاقات خود میرے گھر پر ہوئی۔ چند دوستوں کے ساتھ میں نے انہیں کھانے پر بلایا۔ اتفاق سے وہ اس دن ریڈیو کے کام سے بمبئی آ رہے تھے، وہاں سے وہ کوئی تین بجے میرے گھر پہنچ گئے۔

بہت عرصہ بعد وہ پلنگ پر نہایت بے تکلفی سے لیٹ گئے، اور باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ میں نے آرام کرنے کو کہا مگر وہ باتوں کے موڈ میں تھے۔ مختلف موضوعات پر تین چار گھنٹے مسلسل باتیں کرتے رہے۔ منٹو کا ذکر نکل آیا۔ اسے یاد کر کے ہنستے اور آنسو پیتے رہے۔

"کرشن تم کبھی رنڈیوں کے پاس گئے؟"

"نہیں مجھے پیشہ ور عورتوں سے وحشت ہوتی ہے۔ میرے والد جو ڈاکٹر تھے جیل سے وابستہ تھے۔ وہاں پیشہ ور عورتیں گرفتار ہوتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے عبرت ہوتی تھی۔"

"پیشہ ور اور شریف زادی میں کیا فرق ہے؟"

"وہی جو تاج محل ہوٹل اور فٹ پاتھ پر لگے خوانچے میں ہے۔"

"پیٹ تو دونوں جگہ بھر جاتا ہے۔"

"تاج اور شیرٹن کے کھانے سے پیٹ کے ساتھ دماغ بھی آسودہ ہو جاتا ہے۔ اور فٹ پاتھ کے کھانے سے خونی پیچش کے جراثیم سے پالا پڑتا ہے۔"

"شادی بھی تو اکثر پیشہ ہی بن جاتی ہے۔ جو عورت صرف روٹی کی خاطر شادی کرتی ہے اس میں اور ٹکھیائی میں کیا فرق ہے؟"

"صرف نام کا فرق ہے۔"

"کرشن کبھی فٹ پاتھ یاد آتے ہیں۔"

"فٹ پاتھ کیسے بھول سکتا ہوں۔ اپنی زندگی کا بہترین سرمایہ فٹ پاتھ پر پایا۔ سوچنا، سمجھنا سیکھا۔ لکھنا تو بعد کی بات ہے۔ اصل چیز تو سوجھ بوجھ ہے۔ بیماری نے مجھے زندگی کے دھارے سے کاٹ دیا ہے۔ اب تو دھار کے لمحوں پر جی رہا ہوں۔"

"کبھی موت کا خیال آتا ہے تو؟"

"موت بھی ایک دلچسپ تجربہ ہوتی ہوگی؟"

"زندگی سے زیادہ دلچسپ۔"

"زندگی بہت پیاری شے ہے۔ مگر جب زندگی ملی تو بیماری لگ گئی ——"

"کبھی خودکشی کا خیال آیا؟"

"اکثر، مگر زندگی نے بڑھ کر پیر تھام لیے بارہا میں سمندر کے کنارے بیٹھ کر سوچا کرتا تھا، اس کی تہہ میں کتنا سکون ہوگا۔"

"کیا ایک عورت سمندر کی تہہ ثابت ہو سکتی ہے؟"

"ہاں اور بھنائی ہوئی موجوں کا تھپیڑا بھی۔ وہ قادر مطلق ہے، جلاتی بھی ہے اور مارتی بھی ہے۔" کرشن فسانہ نگاری پر اتر آئے۔

"کفر نہ بکو دوزخ میں جاؤ گے۔"

پھر کچھ پیسوں کا ذکر نکل آیا۔

"ہر مہینہ چادر سے پیر نکل جاتے ہیں۔ مکان کا کرایہ، ٹیلی فون کا بل، ٹیکسیوں کا خرچہ، دعوتیں، شراب! ارے ہاں شراب منگاؤ۔"

"شراب کا جھول ہے۔"

"ارے بابا میری دعا ہے۔"

"اچھا بھئی روؤ نہیں، اللہ کچھ انتظام کر دے گا۔ کیا یہ سب جھنجھٹ زندگی کے لیے ضروری ہیں؟"

"قطعی! میں جی بھر کے جینا چاہتا ہوں موت میرے دروازے پر دستک دے چکی ہے۔ کسی وقت بھی اچانک پکار سکتی ہے، میں اسے سب دینا چاہتا ہوں۔ جو وہ تج کر میرے ساتھ

آئی ہے:

ہم نے "اسے" کی تشریح نہیں کی۔

"میں خود کو ایک مہمان سمجھ کر خاطر کرتا ہوں"

"چھوڑو ان باتوں کو ابھی بہت جینا ہے، بوڑھے کھوسٹ ہو جانا ہے، اور تب بھی یونہی ایک دوسرے سے الجھنا ہے، روٹھنا اور منانا ہے، پھر سب مل کر ایک دفعہ پاکستان جائیں گے۔ جوش، فیض، قاسمی، ہاجرہ، خدیجہ سب سٹر گئے ہوں گے۔ وہاں ایک لمبے چوڑے میدان میں گلے ملیں گے"

پچھلے سال جولائی میں ان پر شدید حملہ ہوا۔ کئی منٹ کیلئے دل کی دھڑکن بند ہو گئی۔ بمبئی کے بڑے بڑے اسپیشلسٹ جٹ گئے۔ انہیں پھر موت کے منہ سے نکال لیا گیا۔ پیس میکر لگا دیا گیا۔ اور وہ پھر جی اٹھے۔

پاکستان میں میں نے دیکھا کہ ان لوگوں کو جو عقیدت کرشن چندر سے ہے۔ اس کی مثال دنیا میں کم ملے گی۔ جو ملتا تھا ان کے بارے میں سوال کی بھرمار کر دیتا تھا۔

عید کا دن تھا ایک لڑکا بوکھلایا ہوا آیا۔

"چودہ میل سے سائیکل پر آ رہا ہوں۔ چودہ گھنٹے گھر ڈھونڈنے میں بیت گئے۔ بس یہ پوچھنا تھا کرشن جی کیسے ہیں؟"

"بالکل اچھے ہیں"

"اس نے شکریہ ادا کیا اور باہر نکل گیا۔

پاکستان سے واپس آکر میں اور بہن جمیلہ کرشن کو دیکھنے گئے، پلنگ پر بیٹھے سیب کاٹ کر سب کو بانٹ رہے تھے، بہت دبلے ہو گئے تھے، مگر چل پھر رہے تھے۔ بات بات پر ہنس رہے تھے، پیس میکر دکھایا، ایک ڈبیہ سی جلد کے نیچے بند تھی، اسکے بل بوتے پر دل دھڑک رہا تھا۔

آٹھ مارچ ۱۹۷۷ء، دہلی میں نورالحسن صاحب کی بیٹی کی شادی تھی، مراثنیں سہاگ گا رہی تھیں، دولہا کی بہنیں آنچل ڈالے اسے مسند پر بیٹھی ہوئی دلہن کی طرف لا رہی تھیں۔ پنڈال برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا، بچے کلکاریاں مار رہے تھے، کسی کی ٹھوکر لگی اور سوئچ نکل گیا، شامیانے میں اندھیرا ہو گیا۔

کرشن چندر! کسی نے تاریکی میں ہولے سے کہا۔

"کیا ہوا کرشن کو؟" اندھیرے سے پوچھا۔

"وہ اب اس دنیا میں نہیں ــــ صبح"

مگر دوسرے لمحے پلگ واپس لگ گیا۔ روشنیاں پھر جگمگا اٹھیں ـــــ شہنائی پھر بج اٹھی، کرشن کے سینے میں پیس میکر لگا ہوا ہے۔ لاکھوں دلوں کی دھڑکن بے تار برقی ان کے دل سے جڑی ہوئی ہے۔ ان کا دل ان الفاظ میں دھڑک رہا ہے جو کاغذ کے صفحوں پر آویزاں ہیں، ان کا دل کیسے چپ ہو سکتا ہے؟ وہ تو ہمیشہ یونہی دھڑکتا رہے گا، موت کی انجانی ٹھوکر سے پلگ نکل جاتا ہے، دم بھر کو لگتا ہے سب چراغ بجھ گئے اب کبھی نہ جاگیں گے۔

مگر سلسلہ پھر جڑ جاتا ہے ـ۔

آنے والی نسلوں کے لیے جلائے ہوئے چراغوں میں فنکار کے دل کی دھڑکن

مقید ہے۔

اور چراغ روشن ہیں۔

ــــ ٭ ــــ

لفنگا

بمبئی سینٹرل کے پہنچتے چنگھاڑتے اسٹیشن پر اتر کر بنجا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر رانی کو ڈھونڈتی رہی مگر رانی نہ دکھائی دی۔ اسے تار دے دیا تھا۔ پہلے خط لکھ چکی تھی۔ مگر نہ جانے کیا بات ہوئی جو رانی نہ آ سکی۔ کوئی کیس آ گیا ایمرجنسی کا۔

وہ ایک ملازمت کے سلسلے میں بمبئی آئی تھی۔ پاپا جی تو شادی کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ نہ جانے ماں باپ کو بیٹی بیاہنے کی کیوں جلدی پڑی رہتی ہے اور جب وہ بیاہ کر جاتی ہے تو روتے ہیں۔ پاپا جی کے دوست کی امپورٹ ایکسپورٹ کی کمپنی تھی۔ پبلک ریلیشن آفیسر کی ضرورت تھی۔ بس گھر کا سا معاملہ تھا۔ بات پکی تھی۔ بس نام کو انٹرویو ہونا تھا۔

بی۔ ایس۔ سی کے بعد گھر میں بیٹھنے کے خیال سے جی اوب چکا تھا۔

رانی کے فلیٹ کا پتا پاس تھا۔ ورنہ بہت مشکل ہوتی۔ ٹیکسی میں آسانی سے پہنچ گئی۔ گھنٹی بجائی تو ایک نہایت بدمزاج لڑاکو قسم کی عورت نے دروازہ کھولا اور کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔ پٹی۔

"کاہے کو بوم مارتا بابا؟"

"ڈاکٹر راٹی ماتھر ۔۔۔"

"ہسپتال میں ہے، شام کو آئے گا۔ آپ جاؤ۔" وہ دروازہ بند کرنے لگی۔

"ارے ستو ۔۔۔ میں دہلی سے آئی ہوں ان کی سہیلی سنجنا!"

دل سے آیا۔ پہلے کاہے کو نی بولا تم؟ آؤ آؤ! باہر کاہے کو کھڑا!" پھر وہ غل سے مراہٹی میں لڑنے لگی۔

"تار تو آبھیج آیا ۔۔۔ میم صاحب دیکھا بھی نہیں ۔۔۔ ڈیوٹی پر آج سات بجے چلا گیا آپریشن تھا کوئی۔"

"اوہ! تو یہ بات تھی، کمال ہے صبح کا دیا ہوا تار اب پہنچا ہے" سنجنا نے آیا کے تیلے ہوئے کمرے میں سامان رکھوایا، منہ ہاتھ دھویا۔

میم صاحب کو ٹیلی فون کر سکتی ہوں؟" آیا چائے لائی تو سنجنا نے پوچھا۔

"ارے بوتی تو تے تار بھی نہیں دیا؟" لاتی بولی

"تار مجھ سے پہلے آگیا۔ رکھا ہوا ہے۔ تم آ رہی ہو؟"

"نہیں ڈارلنگ! نو بجے سے پہلے چھٹی نہ ملے گی۔ بڑا ڈیلیکیٹ آپریشن تھا، تم مزے سے آرام کرو، میرا کچھ ٹھیک نہیں اگر پیشنٹ کی حالت اچھی نہ رہی تو آؤں گی۔۔۔ پیٹ میں بچہ مر گیا تھا،

"اُف!"

آفسوس نہ کرو آٹھواں بچہ تھا، مشکل ہے مریضہ کا بچنا

"کیسا پتھر کا دل ہے تمہارا!" سنجنا بڑبڑائی۔

"اچھا... ہاں! آیا سے کہہ کر جو جی چاہے پکوا لو۔ بس اب گھر داری تمہارے سر!"

ٹیلی فون رکھ کر سنجنا پلنگ پر نیم دراز ہو کر چائے بنانے لگی۔ بڑھیا دروازے پر کسی سے نہایت اونچی آواز میں تبادلۂ خیالات کر رہی تھی۔

"مس صاحب! میرے کو جانے کا ہے۔" آیا اپنی بیٹی اور داماد کا دکھڑا لے بیٹھی۔ آج پھر اس کے داماد نے شراب پی کر اسے مارا ہے، وہ بیچ بچاؤ کرنے اور گالیاں دینے جا رہی ہے، آگے کھانا پکائے گی۔

"کھانے کی تم فکر نہ کرو میں کہیں ہوٹل میں کھا لوں گی۔"

آیا ہوٹل میں کھانے کے پروگرام سے کافی مطمئن ہو گئی۔ فلیٹ کی چابی دے دی اور کچن میں کچھ کھٹر پٹر میں لگ گئی۔ سنجنا کی آنکھ جھپک گئی۔

جب آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا تھا۔ ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ سنجنا نے سوچا نہا لے، اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

"ڈارلنگ! مجھے دیر ہو جائے گی۔ تم کھانے پر میرا انتظار نہ کرنا۔"

سنجنا کا دل بجھ گیا۔ اجنبی شہر کی اجنبی تنہائی! وحشت ہونے لگی۔ اتنا سو چکی تھی، نیند آنے کا سوال ہی نہ تھا۔ ایک دم بھوک بھی معلوم ہونے لگی۔ پہلے سوچا ٹیکسی لے لیکن سمندر کی ٹھنڈی ہوا میں کچھ ایسا نشہ گھلا ہوا تھا کہ چلتی چلی گئی۔ اور پتہ بھی نہ چلا کر سوا نو بج گئے ہیں۔

بمبئی بھی عجیب جگہ ہے۔ انسان بھیڑ میں بھی اکیلا ہی رہتا ہے۔ وہ کتنی دور نکل آئی؟ وہ ٹیکسی لے کر ہوٹل چلی گئی۔ جو کہ فلیٹ سے کافی فاصلے پر تھا۔

بات نہیں ٹیکسی سے واپس پہنچ جائے گی۔ بمبئی میں تو کھو جانے کا کوئی امکان ہی نہیں۔ اسے اندازہ بھی نہ تھا کہ وہ اتنی بھوکی ہے وہ اپنی انٹرویو کے خیال میں ڈوبی کافی میں چمچہ ہلا رہی تھی کہ اسے محسوس ہوا کوئی اسے بہت غور سے دیکھ رہا ہے۔

وہ ایک لمبا سا چھریرے بدن کا نوجوان تھا۔ اس کی میز سے تھوڑی دور وہ اکیلا بیٹھا تھا۔ اور اسی کو تکے جا رہا تھا۔

"شاید کوئی فلم اسٹار ہے۔" سنجنا نے سوچا۔ بیرے اس کے چاروں طرف مکھیوں کی طرح منڈلا رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں دو آدمی اور آگئے اور بہت زور زور سے قہقہے لگانے لگے۔ سنجنا نے بیرے کو بل لانے کے لیے کہا۔

لیکن اپنا بٹوہ کھولا تو دل دھک سے رہ گیا۔ منی پرس غائب تھا! چلتے وقت اس نے ہلکا کرنے کے لیے بٹوے میں سے الا بلا نکال کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دی تھی، شاید منی پرس بھی وہیں چھوٹ گیا۔ شاید اور کچھ روپے پڑے ہوں اس خیال سے وہ بٹوہ کھکھوڑنے لگی۔ مگر ایک نیا پیسہ بھی نہ ملا۔ ہلکا سا پسینہ پیشانی پر پھوٹ نکلا..... اس وقت اس نے دیکھا، وہ لمبا تڑنگا انسان اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

اس نے پھر ایک مرتبہ بٹوہ ٹٹولا۔ یوں ہی دل کو سمجھانے کے لیے۔ بیرا بھی کچھ مشکوک نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ سنجنا کے ہوش اڑنے لگے۔ کوئی بات نہیں وہ مینجر سے کہہ دے گی۔ ڈاکٹر رانی ماتھر کا پتہ لوگ جانتے ہی ہوں گے۔ وہ اٹھنے ہی والی تھی کہ.....

"میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟" وہ لمبا انسان اجازت کا انتظار کیے بغیر اس کے سامنے والی

کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ اشارے سے اس نے بیرے سے کافی لانے کو کہا۔

"شوق سے بیٹھئے، میں جا ہی رہی تھی۔"

"سچ؟" اس نے بہت تیکھے انداز میں پوچھا۔

"جی؟" سنجنا نے سمجھ کر بھی جان کر انجان بن گئی اور اٹھنے لگی۔

"پلیز سیٹ ڈاؤن۔" اس نے بہت نرمی سے کہا۔

"مگر......" سنجنا بیٹھ گئی۔ اسے اس اجنبی پر غصہ آنے لگا۔

"یہ بمبئی ہے۔!"

"جانتی ہوں۔" سنجنا نے بے رُخی سے کہا۔

"شاید! مگر جہاں تک میرا اندازہ ہے آپ نووارد ہیں۔"

"کیا آپ سی۔ آئی۔ ڈی سے تعلق رکھتے ہیں؟" سنجنا نے اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا۔

"اور جس طرح آپ ٹوہ ٹٹول رہی تھیں اس سے ثابت ہوتا ہے......"

"میں پوچھ سکتی ہوں آپ کیا خدائی فوجدار ہیں؟" سنجنا بھڑک اٹھی۔

"مینیجر بہت کائیاں ہے!" اس نے سنجنا کے غصے کو ٹال کر کہا۔

"مگر میں..... میں پیسے مار کر بھاگنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ اپنا پتہ دے دوں گی۔"

"صحیح پتا یا کوئی دل سے گھڑ کے؟"

"آپ نہایت بدتمیز ہیں!" سنجنا بھنا کر اٹھنے لگی۔

"تماشہ بن جائیے گا!" اس نے سنجنا کو روکنے کیلئے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"دیکھیئے مسٹر! میں بمبئی میں نووارد ہوں لیکن بچی نہیں ہوں....."

"باتیں تو بچیوں جیسی کر رہی ہیں؟"

"مگر آپ کو کیا، آپ اس ہوٹل کے مالک ہیں؟"

"مالک نہیں مستقل گاہک ضرور ہوں، یہاں سب مجھے جانتے ہیں۔ اتنی دیر سے آپ سے باتیں کر رہا ہوں، وہ سمجھ رہے ہیں کہ میری کوئی جان پہچان کی ہیں۔ اب اگر آپ بل نہ دے پائیں تو لوگ سمجھیں گے کہ میری آپ کی لڑائی ہو گئی ہے اور میں نے آپ کو ذلیل کرنے کے لیے بیچ بھنور میں چھوڑ دیا ہے۔ وہ مکاری سے ہنسا۔

اگر اتنا جی نہ جل رہا ہوتا تو نجنا خود مسکرا دیتی۔ اس کے دانت کتنے سفید اور چکیلے تھے

"مینجر اپنا آدمی میرے ساتھ بھیج سکتا ہے میں اسے بل ادا کر دوں گی۔"

"یہ بمبئی ہے میڈم! یہاں کوئی بھروسہ کرے تو چار دن میں دیوالیہ ہو جائے۔ ہوٹل سے نکل کر آپ مکر جائیں، یا راستے میں چکمہ دے کر سرک جائیں تو وہ بے چارہ کہاں فوجداری کرتا پھرے گا۔"

"آپ مجھے چور سمجھتے ہیں؟" پارہ پھر چڑھنے لگا۔

"میں آپ کا بل چکائے دیتا ہوں پھر...."

"پھر؟" نجنا غصے سے تمتما اٹھی۔ جی چاہا اس کا منہ کھسوٹ لے۔

پھر کمینہ وصول کرے گا، کیا سمجھ رہے ہو وہ اسے کوئی ٹکیائی سمجھا ہے۔

"اوہو! یہ میرا پتہ ہے آپ...."

"مجھے نہیں چاہیے آپ کا پتا، آپ ہوتے کون ہیں میرے معاملے میں دخل دینے والے، جائیے اپنا راستہ ناپیے ورنہ میں۔۔۔"

"کیا بیوقوف لڑکی ہے!"

"زبان سنبھال کر بات کیجیے۔"

"اچھا بابا! کل روپے واپس کر دینا بس! بیکار تماشہ بن جائے گا، مینیجر بہت سخت آدمی ہے۔"

"لیکن میں پوچھتی ہوں اس مہربانی کی وجہ!"

"آ۔۔۔ پتہ نہیں۔" وہ کھسیانی ہنسی ہنسا۔

"جی مجھے پتا ہے"

"تب تو آپ بہت عقلمند معلوم ہوتی ہیں"،

آپ لفنگے ہیں۔"

"جی نہ۔۔۔!"

اور مجھے بھی اپنے جیسی کوئی۔۔۔"

"اے بکواس نہ کرو، تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو دانت پھاڑ دیتا سالے کے۔۔۔"

"لیو۔۔۔" سنجنا گھبرا کر اٹھنے لگی۔

"چپکی بیٹھو!" اس نے ڈانٹ بتائی پھر کاؤنٹر پر جا کر بل ادا کرنے لگا۔ اس وقت سنجنا کے پاس منی پرس ہوتا اس کمینے انسان کو مزہ چکھا دیتی، لیکن یہ

ذلت بھی جھیلی تھی ۔ وہ یل پکار رہا تھا کہ سنجنا بٹوہ اٹھا کر تیزی سے باہر نکل گئی ۔

باہر دھواں دار بارش ہو رہی تھی ۔ اک پل کو قدم رُک گئے ۔ لیکن اسے پیچھے تیزی سے

آتے دیکھ کر ہاتھ پاؤں پھول گئے ۔ سر پر پلّو ڈال کر وہ تیز تیز چلنے لگی ۔

اجنبی باہر نکلا چاروں طرف دیکھا اسے جاتے دیکھ کر دربان سے چھتری چھینی اور

لمبے لمبے ڈگ بھرتا آیا اور اس کے سر پر چھتری کا سایہ کر دیا ۔

"آپ جانتے ہیں کہ ۔ ۔ ۔"

"بھیگ گئیں تو مر جاؤ گی ۔ ۔ ۔ ۔"

"آپ کی بلا سے !"

"اِدھر میری کار کھڑی ہے ۔ دم بھر میں پہنچا دوں گا ۔"

"نہیں !" اس نے پہنچانے والوں کے بہت سے قصے سنے تھے ، وہ خوب جانتی تھی ۔

"آپ جانتے ہیں کہ میں پولیس کو بلاؤں ۔"

"کہاں ہے پولیس ؟" وہ شیطان کی طرح قہقہہ لگا کر بولا ، پانی کے چھینٹوں نے سنجنا

کے آنسوؤں کی لاج رکھ لی ۔ وہ سر سے پیر تک کانپ رہی تھی ، سڑکیں سنسان ہو چکی

تھیں ، ہر لمحہ وہ یہی سمجھی کہ اب اس نے کوئی شرارت کی ، سامنے جب بلڈنگ نظر آئی تو اس

کی جان میں جان آئی ۔

"اب تو ڈر نہیں کہ میں تمہیں کھا جاؤں گا ۔"

"مگر آپ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آخر کیوں ناحق میرے پیچھے پڑے ہیں ؟"

"عادت خراب ہے۔ خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر راجپوتی خون جوش مارنے لگتا ہے۔"

سنجنا کو ایک دم شرمندگی ہونے لگی، ناحق وہ اس سے بدظن ہو گئی۔

"میں۔" وہ مری ہوئی آواز میں بولی۔ "آئی ایم سوری!"

"کوئی بات نہیں۔" تھوڑی دیر دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔

"کیا صورت سے میں واقعی لفنگا معلوم ہوتا ہوں۔"

سنجنا نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھری شرارت سے وہ پھر چڑ گئی۔ وہ اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ چھیڑ چھیڑ کر اس نے بڑی احمقانہ حرکتوں پر مجبور کر دیا۔ نہ جانے کیوں اسے دیکھتے ہی اس سے اتنی شدید چڑ ہو گئی۔ وہ بغیر جواب دیئے جلدی سے اندر بھاگ گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو چھتری ٹیڑھی کئے اسے جاتے دیکھ رہا تھا۔ بال بھیگ کر ماتھے پر چپک گئے تھے۔ اور ناک پر پانی کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ خود کو محفوظ پا کر اس کا دل اطمینان سے کھل اٹھا۔ جی چاہا، اس کی قیمتی پتلون دیکھ کر جو کیچڑ اور پانی میں لت پت ہو رہی تھی، خوب ہنسے، اچھا ہوا ڈھٹائی کی یہی سزا ہے۔ اب چھپا چھپ کرتا واپس جائے گا۔

رانی بال بکھیرے قالین پر پھسکڑا مارے بیٹھی کوئی میڈیکل میگزین پڑھ رہی تھی۔

"تجھے موت آئے ظالم۔" اس نے سنجنا کو دیکھ کر کہا۔ "کہاں چلی گئی تھی ری۔۔۔ میں سمجھی تجھے غنڈہ پکڑ کر لے گیا!"

"آئے ہائے، میں کوئی دودھ پیتی بچی ہوں کہ تم بھی میری فکر میں گھلنے لگیں!"

"بمبئی کا مطلب ری ؟ اور کون نیرا سگا سوتیلا ہے، بمبئی میں!"

"کیوں نہیں ایک سے ایک لفنگے بھرے پڑے ہیں۔ تمہاری بمبئی میں!"

سنجنا نے سارا قصّہ مزے لے کر اسے سنایا

"کوئی شریف آدمی تھا" رانی نے فیصلہ کیا۔

"ارے پورا لفنگا تھا"

"کچھ بدتمیزی تو نہیں کی بیچارے نے ؟"

"ارے مجال تھی جو بدتمیزی کر جاتا! میں نے شروع ہی سے ایسا تیا کاٹا کہ سٹپٹا گیا

نہ جانے گاڑی بھی تھی بھی یا یوں ہی ہانک رہا تھا"

"اری اس کا پتہ تو پوچھ لیا ہوتا"

"کاہے کو جی؟"

"کیا بل کے پیسے چرا جائے گی اس کے ؟"

"ارے یہ تو بھول گئی"

"خیر یہ بھی اچھا ہوا، یاد کریں گے بچہ جی کسی لفنگی سے پالا پڑا تھا"

دونوں سہیلیاں ایک بجے تک سر جوڑے باتیں کرتی رہیں۔ سنجنا نے بکتے بکتے دیکھا رانی وہیں قالین پہ باتیں کرتے کرتے سو گئی۔ غریب سارے دن کی تھکی ہوئی تھی۔ اور سنجنا اس کا دماغ چاٹ رہی تھی۔ اس نے ایک کشن اٹھا کر اس کے سر کے نیچے رکھ دیا۔ اور خود بھی وہیں لیٹ گئی۔

سونے سے پہلے لفنگے کا چھتری کے نیچے سے جھانکتا ہوا حلیہ یاد آکر اسے ہنسی آگئی مگر قصور تو بیچارے کا کچھ نہ تھا۔ پھر کیوں اسے اتنا غصہ آگیا۔ ہینڈسم تو تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ پرائے پھٹے میں پیر اڑانے لگے۔ کہتا تو ٹھیک تھا کہ تماشہ بن جائے گا! نہ جانے مینجر کیا کہتا، کیا کرتا، کچھ بھی ہوتا وہ کون تھا دخل دینے والا؟ پتہ پوچھ لیتی تو بل واپس کر دیتی۔ نہ جانے کیا سوچے گا اس کے بارے میں۔

خیر دوسرے دن انٹرویو تھا۔ گیارہ بجے پہنچنا تھا۔ صبح تیار ہو کر ٹیکسی منگانے لگی تو آیا نے بتایا کہ کمپنی کی کار ایک گھنٹے سے کھڑی ہے۔ سنجنا کو بہت حیرت ہوئی، پاپا ہی کے دوست کی کمپنی تھی اسی لیے گاڑی بھیجی گئی۔ آیا کو اس نے کھانا بنانے سے منع کر دیا۔ وہیں کسی ہوٹل میں سینڈوچ اور کافی لے لے گی۔

انٹرویو کے لیے انتظار نہ کرنا پڑا۔ کوئی دوسرا کنڈیڈیٹ نہ تھا۔ پاپا جی نے کہا تھا معاملہ پکا ہو چکا ہے۔ گھر ہی کا معاملہ ہے۔ دفتر میں داخل ہوئی تو دل دھک سے رہ گیا۔

سامنے وہی ہوٹل والا لفنگا کرسی پر بیٹھا کاغذات الٹ پلٹ رہا تھا، سنجنا الٹے پیروں واپس ہونے کو مڑی۔

"بیٹھیے" اس نے بغیر نظریں اٹھائے بے پروائی سے کہا۔ قسمت کی ستم ظریفی پر سنجنا کو ہنسی آگئی۔ اتنی دور سے جھک مار کر آنا بھی خاک میں مل گیا۔ وہ چپ چاپ جانے لگی۔ پھر ہوٹل کے بل کا خیال آگیا۔ بٹوے میں سے دس دس کے نوٹ نکال کر اس نے میز پر ڈال دیئے۔

تب اس نے اپنی بھاری بھاری آنکھیں اٹھائیں، اجنبیوں کی طرح اسے کبھی لٹو لٹی

کو دیکھنے لگا۔

"بل" سنجنا کے گلے میں الفاظ اٹکنے لگے۔

"بل!....."

"جی، رات کو جو آپ نے کھانے کا بل ادا کیا تھا" وہ تیزی سے واپس چلی۔

"سنئے" سنجنا رک گئی۔ "سن لینے میں ایسا کیا بگڑ جائے گا۔"

"سننے کا سوال ہی ختم سمجھئے۔"

"وہ آتی ہی ہوں گی" کلائی پر باندھی ہوئی گھڑی دیکھ کر اس نے کہا۔

"کون؟"

"وہی جنہیں آپ کا انٹرویو لینا ہے۔"

"مگر......"

"کیا اب بھی آپ کو ڈر معلوم ہو رہا ہے۔ کہ میں آپ پر حملہ کر بیٹھوں گا"

"دیکھئے مسٹر..... میں....."

"رام رام کیا ٹریفک تھا!" ایک دم دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر کی شریمتی جی سفید سلک کی ساڑھی پہنے کشمیری شال سنبھالتی داخل ہوئیں، مچیونٹی کی چال سے گاڑی آئی ہے۔ لیکن پھر بھی بمپر کو مار لگ گئی" پھر ایک دم وہ سنجنا کو تکنے لگیں۔

"سنجو!..... سنجو ہی ہے نا۔" انہوں نے تفکے سے پوچھا اور دونوں ہاتھ سنجنا کی طرف پھیلا دیئے۔ "ہائے رام کتنی لمبی ہو گئی! ودیا تو اچھی ہے؟....   چیچا جی کے گھٹنوں

کا درد کیسا ہے؟ دیکھا اکیلی کو بھیج دیا، خود نہ آئے..... پیروں میں مہندی لگی تھی نا۔"
انہوں نے پیار سے سنجنا کو صوفے پر بٹھایا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں بلائیں لینے لگیں۔ سنجنا کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

"میں نے راجو کو اسٹیشن پر لینے بھیجا۔ پر ناس جائے اس ٹریفک کا جب وہ پہنچا تو پلیٹ فارم خالی ہو چکا تھا۔"

"راجو..... اسٹیشن....." سنجنا کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"دیدی یہ چٹھی تو پڑھو، آج ہی صبح ملی۔"

"ارے ہٹا دے چٹھی وٹھی، میں اپنی عینک بھول آئی۔ ہاں! کہاں ٹھہری ہے سنجو!"

"رانی ..... ڈاکٹر ماتھر کے ہاں۔"

"ہت تیری! بڑی ڈاکٹرنی بنی پھرتی ہے، کیا بد بودار دوا دی ہے۔ میری کمر کے درد کے لیے ہسپتال گئی ہوگی۔"

"جی....." سنجنا کو چکر آرہے تھے۔

"دیدی..... پلیز چٹھی!"

"نہیں پڑھنی ہے چٹھی، تو پڑھ کے سنا، نہ جانے کیا اوٹ پٹانگ باتیں لکھ دیتے ہیں۔ جیجا جی، کیوں رے میں نے کیا کہا تھا؟" انہوں نے جھک کر راجو کے کان میں کہا۔ "پسند ہے نا؟"

"اصل بات تو تمہاری پسند کی ہے، تمہاری خاطر ہم بھی جھیل جائیں گے۔"

چل پاجی، مجھ سے چالیس چلتا ہے۔ اچھا دیکھ لنچ کے بعد سنجو کا سامان رانی کے ہاں سے لے آنا، وہ تو ہسپتال کی ہو کر رہ گئی ہے، یہ بیچاری اکیلی پاگل ہو جائے گی۔"

"سامان ہی..... یا...."

"دیکھ رے لڑکے میرے منہ نہ لگنا۔"

"تم نے چھٹی تو پڑھی نہیں بک بک کئے جا رہی ہو، سامان ہم لے آئیں گے۔ جھگڑوں کا پچھا تم سنبھالو!"

"اچھا اچھا بتاتی ہوں!" دیدی نے پھر ہاتھ اٹھایا: "مجھے مہورت کے لیے پنڈت جی سے بات کرنا ہے، پھر جیجا کو تار دے دو، نہیں تار سے کام نہیں چلے گا۔ ٹرنک کال بک کرا لو!"

"مگر....." سنجنا کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

"بٹیا میرا آج بارات ہے۔ تم لنچ کے بعد آ جاؤ۔" سنجنا کے کچھ کہنے سے پہلے وہ آندھی کی طرح آئیں اور طوفان کی طرح چل دیں۔ راجیو نے دروازہ بند کر دیا۔

"میں..... پلیز....." وہ بھی جانے لگی۔

"بیٹھ جائیے۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

"آپ کی سمجھ میں تو چھوٹی چھوٹی باتیں بھی نہیں آتیں اور یہ بات تو خاصی باریک ہے، ذرا چند منٹ کے لیے بیٹھ جائیے، سب سمجھا دوں گا۔"

"لیکن...." مگر سنجنا بیٹھ گئی۔

"پہلے تو یہ خط پڑھیے":

"پاپا جی کا خط!"

پاپا جی نے لکھا تھا۔ "شادی کے نام سے بھڑکتی ہے۔ طبیعت میں ذرا ضد اور بچپنا باقی ہے، ہم نے اسے کچھ نہیں بتایا، نوکری کے لیے انٹرویو کا بہانہ کر کے بھیجا جا رہا ہے۔ آگے تم جانو اور تمہارا کام۔" تو سب ہی اس کا کھیل بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ غصے سے سنجنا کا خون کھولنے لگا۔

"خالی پیٹ غصہ ٹھیک نہیں۔ پہلے پیٹ پوجا پھر...."

اسی ہوٹل میں اسی میز پر لنچ کے دوران راجو نے بتایا

"ڈیڈی کسی بات پر اڑ جائیں تو بس جان کو آجاتی ہیں، بیٹے کی طرح پالا ہے، اس لیے ماں کی طرح دھونس جماتی ہیں، مجھے بزنس کی وجہ سے دہلی جانے کی فرصت نہیں ملی اس لیے...."

"تو یہ پلان آپ نے بنایا تھا؟" پھر غصہ چڑھنے لگا۔

"میں نے سوچا اگر جاب کے لیے آپ انٹرویو کے لیے آئیں تو.... مناسب رہے گا ورنہ دوسری صورت میں.... کچھ اچھا نہ ہوگا۔"

"دوسری صورت.... یعنی اگر آپ مجھے پسند نہ فرمائیں تو....."

اگر بس چلتا تو وہ اس کے چہرے پر سے مسکراہٹ نوچ کر پھینک دیتی۔ "اچھی

چالیس چل لیتے ہیں، شہہ سے بچنے کے گر بھی آتے ہی ہوں گے۔"

"عام طور سے!" بہت وثوق سے کہا گیا۔

"اگر کوئی بساط الٹ دے تو ....."

"ایسے اناڑیوں سے بھی بھگت لوں گا۔"

"راج ونس کھنہ" صاحب .... آپ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں؟"

"بس، گھر چل کے لڑنا ورنہ لوگ کیا کہیں گے؟ ابھی سے یہ حال ہے، تو بعد میں ...."

"بعد میں .... اچھا تو بعد کی بھی امید ہے۔"

"قطعی! اور میری کسی اُمید نے آج تک مجھے مایوس نہیں کیا!"

ایک دم بھر کر سنجنا نے تڑ سے کوئی جلا کٹا جواب دینا چاہا، لیکن الفاظ ہونٹوں پر الجھ کر رہ گئے۔ لفنگے کی آنکھوں میں ناچتی ہوئی مسکراہٹ دیکھ کر وہ اپنی ہنسی نہ روک سکی۔

"قسم لے لیجیے میں نے آپ کا منی پرس نہیں چرایا۔!!"

گھر والی

جس دِن مرزا کی نئی نوکرانی لاجو گھر میں آئی تو سارے محلے میں کھلبلی مچ گئی۔ جمعدار جو مشکل سے دو جھاڑو ڈنڈے مار کے بھاگ لیتا تھا، اب زمین چھیلے پھینکتا تھا۔ گوالا جو دودھ میں پانی کا چھینٹا دے کے سرمنڈھ جایا کرتا تھا، اب گھر سے کڑھا ہوا دودھ لانے لگا۔ ایسا گاڑھا کہ ربڑ کا گمان ہوتا تھا

پتا نہیں کہ کس ارمان بھری نے لاجو نام رکھا ہو گا۔ لاج اور شرم کا لاجو کی دنیا میں کوئی مصرف نہ تھا۔ نہ جانے کہاں اور کس کے پیٹ سے نکلی، سڑکوں پر رُل کر پلی، تیرے میرے ٹکڑے کھا کر اس قابل ہو گئی کہ چھین جھپٹ کر پیٹ بھر سکے۔ جب سیانی ہو گئی تو اس کا جسم اس کی واحد دولت ثابت ہوا۔ جلد ہی ہم عمر آوارہ لونڈوں کی صحبت میں زندگی کے اچھوتے راز جان گئی اور شتر بے مہار بن گئی۔

مول تول کی اسے قطعی عادت نہ تھی۔ کچھ ہاتھ لگ گیا تو کیا کہنے، نقد نہ سہی ادھار سہی، جو ادھار کی بھی توفیق نہ ہو تو خیرات سہی۔

"کیوں ری، تجھے شرم نہیں آتی۔؟" لوگ اس سے پوچھتے۔

"آتی ہے۔" وہ بے حیائی سے شرما جاتی۔

"ایک دن کھتا کھائے گی۔"

لاجو کو کب پرواہ تھی؟ وہ تو کھٹا میٹھا ایک سانس میں ڈکار جانے کی عادی تھی۔ صورت بلا کی معصوم پائی تھی۔ آنکھیں بلا کاجل کے کالو پنچ بھری۔ چھوٹے چھوٹے دانت، میٹھا رنگ۔ کیا پھیکت قسم کی درغلانے والی چال پائی تھی کہ دیکھنے والوں کی زبانیں رک جاتیں اور آنکھیں بکواس کرنے لگتیں۔

مرزا کنوارے تھے۔ ہاتھ سے روٹیاں تھوپتے تھوپتے اُلّو ہو گئے تھے۔ چھوٹی سی لباط خانے کی دوکان تھی۔ جسے وہ جنرل اسٹور کہتے تھے۔ گھر جا کر شادی کرانے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ کبھی بیوپار ایسا مندا ہوتا کہ دیوالیہ نکلنے کی نوبت آجاتی، کبھی ایسی لوٹ کے بکری ہوتی کہ سر اٹھانے کی مہلت نہ ملتی۔ سر پر سہرا بندھوانے کی تو بات ہی کیا۔

بخشی کو لاجو ایک بس اسٹاپ پر ملی تھی۔ بیوی پورے دنوں سے تھی، نوکرانی کی ضرورت تھی۔ جب بچہ ہو گیا تو اسے مار کر نکال دیا۔ لاجو تو پٹنے اور نکلنے کی عادی تھی مگر بخشی کو کچھ اس کی لت سی پڑ گئی تھی۔ لیکن اب اسے سمندر پار بڑے معرکے کی نوکری مل گئی تھی، اس لیے اس نے سوچا کہ لاؤ بھئی اسے مرزا کے ہاں ڈال آئیں۔ کنجریوں میں مٹی پلید کراتے ہیں، ذرا یہ مفت کا مال بھی چکھ دیکھیں۔

"لاحول ولاقوۃ۔ میں بیچ عورتوں کو گھر میں ڈالنے کا قائل نہیں۔" مرزا بدک گئے۔

"ارے میاں ہٹائیے بھی۔ سارا کام کاج کرے گی سو گھاتے میں۔" بخشی نے سمجھایا

"نہیں بھئی! یہ لعنت کہاں میرے سر منڈھے جاتے ہو اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتے ہو؟"

"میرا اکیلے کا ٹکٹ آیا ہے۔ سارے کنبے کا نہیں آیا۔"

اتنے میں لاجو باورچی خانے پر دھاوا بول چکی تھی۔ لہنگے کو لنگوٹ کی طرح کسے ہوئے لمبا بانس جس کے سر پر جھاڑو بندھی تھی لیے سارے گھر میں گھماتی پھر رہی تھی۔ بخشی نے جب اسے مرزا کے فیصلے کی اطلاع دی تو اس نے بالکل نوٹس نہیں لیا۔ اس نے پتیلیاں مچان پر جانے کو کہا اور خود نل پر پانی لینے چلی۔

"اگر تو کہے تو واپس گھر پہنچا دوں۔"

"چل دور ہو! تو میرا خصم ہے جو میکے چھوڑ آئے گا۔ جا اپنا راستہ لے۔ ہم یہاں سے نمٹ لیویں گے۔"

بخشی نے موٹی موٹی گالیاں دیں کہ حرافہ اکڑتی کاہے۔ پر ہے لاجو نے اس سے بھی تگڑی گالیاں دیں کہ بخشی جیسے لفنگے کو بھی پسینہ چھوٹ گیا۔

بخشی کے جانے کے بعد مرزا کی ایسی سٹی گم ہوئی کہ وہ اک دم بھاگ لیے مسجد میں بیٹھے سوچتے رہے۔ بے کار کا خرچ بڑھے گا۔ چوری الگ کرے گی۔ کیا بلا سر پر آپڑی۔ مغرب کی نماز کے بعد گھر لوٹے تو دم بخود رہ گئے۔ جیسے بی اماں مرحومہ واپس تشریف

لے آئی ہوں، گھر چندن ہو رہا تھا۔ پانی پینے کا کورا مٹکا جس پر منجھا ہوا کٹورا اجلا رہا تھا، لالٹین صاف جگمگاتی۔

"میاں کھانا اتار دوں۔۔؟" لاجو نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔

"کھانا؟"

"تیار ہے، گرم گرم روٹی ڈالتی ہوں، ابھی آپ بیٹھئے۔" بغیر جواب سنے وہ رسوئی گھر میں چلی گئی۔

آلو پالک کی ترکاری، دھلی مونگ کی دال، زیرہ اور پیاز سے بگھاری ہوئی بس اماں جی کے ہاتھ سے کھائی تھی۔ گلے میں نوالا اٹکنے لگا۔

"پیسے کہاں سے لائی۔۔؟" انہوں نے پوچھا۔

"بنیئے سے سامان ادھار لے آئی۔"

"میں تمہاری واپسی کا کرایہ دے دوں گا۔"

"واپسی؟"

"ہاں میری۔۔۔۔۔ حیثیت نہیں۔"

"کون مانگے ہے تنخواہ؟"

"مگر۔۔۔۔۔؟"

"زیادہ مرچیں تو نہیں۔" لاجو نے پھلکا رکابی میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔ گویا بات ختم۔ جی چاہا کہہ دیں، نیک بخت سر سے پیر تک مرچیں ہی مرچیں لگی ہوئی ہیں، مگر

لاجو چھپا چھپ تازہ پھلکے لانے میں لگی ہوئی تھی۔ جیسے رسوائی میں کوئی بیٹھا پکا پکا کے دے رہا ہو۔

"خیر صبح دیکھا جائے گا" مرزا یہ سوچ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ عمر میں پہلی دفعہ ایک عورت گھر میں سو رہی تھی۔ نہ جانے کیسا لگ رہا تھا۔ تھکے ہوئے تھے سو گئے۔

"نا میاں میں نہ جانے کی" صبح کو جب انہوں نے اس کے جانے کی بات چھیڑی تو لاجو نے الٹی میٹم دے دیا۔

"مگر......"

"کیا میرے ہاتھ کا کھانا پسند نہ آیا۔؟"

"یہ بات نہیں"

"گھر کی جھاڑو بہارو نا کی؟"

"وہ تو سب ٹھیک ہے مگر....."

"تو پھر کون سجا ہوئی۔؟" لاجو گرم ہو گئی۔

پہلی ہی نظر میں لاجو دل دے بیٹھی تھی۔ مرزا کو نہیں گھر کو۔ بغیر مالکن کا گھر اپنا ہی ہوا نا۔ گھر مرد کا تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ وہ تو مہمان ہوتا ہے۔ بخشی موا تو کپڑوں بھرا کباب تھا۔ الگ کوٹھا کر کے رکھا تھا۔ ادر کوٹھا بھی کم بخت نندی کمار کی بھینس کا طبیلہ بھینس تو کبھی کی خدا کو پیاری ہو چکی تھی۔ مگر ایسی بو چھوڑ گئی تھی کہ لاجو کی رگ رگ

میں رچ گئی تھی اور اوپر سے نخرے کرتا تھا سوالگ۔ یہاں گھر کی رانی تو وہی تھی۔

مرزا نرے بھوندو تھے، یہ لاجو نے دیکھتے ہی تاڑ لیا تھا۔ واقعی مہمانوں کی طرح آتے، چپ چاپ جو آگے رکھ دیتی کھا لیتے، پیسے دے جاتے۔ دو چار مرتبہ حساب پوچھا، پھر اطمینان ہو گیا کہ لوٹتی نہیں۔ صبح کو گئے شام کو آتے۔

لاجو دن بھر گھر کو سنوارتی، آنگن میں نہاتی، کبھی جی چاہتا تو پڑوس میں رامو کی دادی کے پاس جا بیٹھتی۔ رامو مرزا کے اسٹور میں کام کرتا تھا۔ لاجو پر فوراً گرم ہو گیا، تیرہ چودہ برس کا ہوگا۔ منہ پر دھڑ دھڑ مہاسے، بری صحبت میں مٹی ہو گیا تھا۔ اسی نے بتایا کہ مرزا اکثر کنجری کے ہاں جاتے ہیں۔

لاجو کو بہت برا لگا۔ بے کار کا خرچہ، ڈائنیں ہوتی ہیں یہ کنجریاں، آخر وہ خود کس مرض کی دوا تھی؟ آج تک جہاں رہی سب ہی خدمات خوش اسلوبی سے سنبھالیں۔ لاجو کو آئے ہفتہ گزر گیا تھا۔ ایسی بے قدری اس کی کہیں نہیں ہوئی۔ مرد و عورت کے رشتے کو اس نے ہمیشہ فراخ دلی سے دیکھا۔ پیار ہی اس کے لیے سب سے حسین تجربہ تھا۔ کچی عمر سے اسے اس پیار سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ نہ ماں ملی نہ دادی نانی جو اونچ نیچ سمجھاتیں۔ اس معاملہ میں لاجو بالکل پڑوس کی بلی تھی جو بلوں کے التفات کو اپنا حق سمجھتی تھی۔

ادھر ادھر سے بہت پیغامات اسے مل رہے تھے مگر وہ مرزا کی نوکرانی تھی۔ ۔۔۔ نے اوروں کو ٹال دیا کہ لوگ ہنسیں گے مرزا پر۔

مرزا اوپر سے برف کا تو وہ بنے بیٹھے تھے ، اندر بیچاروں کے جوالا مکھی دہک رہا تھا ۔ جان بوجھ کر گھر سے کٹے کٹے سے رہتے ۔ عجیب دل کا عالم تھا ۔ کچھ محلے کے منچلوں کا بھی ان کی دہشت میں ہاتھ تھا ، جدھر دیکھو لاجو کے چرچے ۔ آج اس نے دودھ والے کا منہ کھسوٹا ۔ کل تیواڑی کے تھوبڑے پر گوبر اٹھا کے دے مارا ۔ جدھر جاتی ۔ لوگ ہتھیلی پر دل لے کے دوڑے پڑتے تھے ، اسکول کے ماسٹر جی گلی میں مل جاتے تو اسے شکشا دینے پر مصر ہو جاتے ، مسجد سے نکلتے ہوئے ملا جی بھی اس کے کڑوں کی آواز سن کر آیۃ الکرسی پڑھنے لگتے ۔ مرزا کچھ چڑے ہوئے سے گھر میں گھسے ۔ لاجو اسی دم نہا کر آئی تھی ۔ گیلے بال سانولی پر پڑے تھے ۔ چولہا پھونکنے کی وجہ سے گال تمتا رہے تھے ۔ آنکھیں چھلک رہی تھیں میاں کو بے وقت آتا دیکھ کر دانت نکوس دیئے ۔ مرزا ہڑبڑا کر گرنے سے بچے ۔

سر جھکا کر روٹی کھائی ۔ پھر اٹھ کر مسجد میں جا بیٹھے ۔ مگر دل گھر میں پڑا تھا پتا نہیں بیٹھے بٹھائے گھر کیوں ایک دم یاد آنے لگا تھا ۔ لوٹے تو لاجو دروازے پر کھڑی کسی سے جھگڑ رہی تھی ، مرزا کو دیکھ کر وہ مٹک گیا ۔

"کون تھا ۔ ؟" انھوں نے شکی شوہر کی طرح پوچھا ۔

"رگھوا ۔"

"رگھوا ۔ ؟" مرزا برسوں سے دودھ لیتے تھے ۔ مگر گوالے کا نام بھی معلوم نہیں تھا ۔

"دودھ والا۔" حقہ تازہ کر دوں میاں۔" لاجونتی لینے لگی۔

"نہیں۔ کیا کہتا تھا۔؟"

"پوچھتا تھا، کتنا دودھ لاؤں۔؟"

"پھر تم نے کیا کہا۔؟"

"میں نے کہا تیری ارتھی اٹھے، جتنا روز لاتا ہے۔"

"پھر۔؟" مرزا کانپنے لگا۔

"پھر میں نے کہا۔ حرامی اپنی اماں بھینسا کو دودھ پلا۔"

"اُلو کا پٹھا، بڑا حرامی ہے رگھوا، بند کر دو دودھ۔ ہم اسٹور سے واپسی پر لے آئیں گے۔"

رات کا کھانا کھانے کے بعد مرزا نے بڑے ٹھسّے کے ساتھ کلف دار کرتا پہنا، عطر کی پھریری کان میں اٹکائی اور چھڑی سنبھال کر کھنکارتے ہوئے چل دیئے لاجو جل بھن کر کباب ہو گئی۔ پتی ورتا کی طرح گم صم دیکھتی رہی۔ اور من ہی من میں اس کنجری کو کوستی رہی، وہ مرزا کو پسند نہیں۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔

کنجری اپنے دوسرے گاہک کو نمٹا رہی تھی۔ مرزا جگر کے لالہ کی دوکان پر جا بیٹھے مہنگائی اور سیاسی الٹ پھیر پر جی جلا کے واپس جھنجھلاتے ہوئے لوٹے تو گیارہ بج چکے تھے۔ پانی کی مراحی سرہانے رکھی ہوئی تھی مگر دھیان نہ گیا۔ باورچی خانہ والے ایک دریچے میں مٹکا رکھا تھا۔ غٹ غٹا کر ٹھنڈا پانی پیا۔ مگر جی کی آگ اور بھڑک

اٹھے۔

لاجو کی چکنی سنہری ٹانگ دروازے کی آڑ سے جھانک رہی تھی، بے ڈھنگی سی کروٹ پر اس کے کپڑے کسمسائے اور ٹانگ اور لپیر گئی۔ مرزا نے ایک گلاس اور چڑھایا اور لاحول کا ورد کرتے ہوئے پلنگ پر گر پڑے۔

کروٹیں لے کر جسم چھل گیا۔ پاتی پی کر پیٹ نقارہ ہو گیا۔ دروازے کے پیچھے سے ٹانگ کچھ اور بھی اڑنگے لگانے لگی۔ ان جانا خوف گلا دبوچنے لگا۔ بڑا اودھم مچائے گی نامراد، مگر شیطان نے پیچھے سے دھکیلنا شروع کیا۔ اپنے پلنگ سے ایک درّے تک، نہ جانے کتنے میل کے چکر کاٹ چکے تھے۔ اب ان میں دم نہیں تھا۔

پھر ایک نہایت بھولا بھالا سا خیال ان کے دل میں سر اٹھانے لگا۔ اگر لاجو کی ٹانگ اتنی کھلی نہ رہے تو انہیں اتنی پیاس نہ لگے۔ اس خیال نے جیسے ہی پھن اٹھایا ان کی ہمت بڑھ گئی۔ نامراد جاگ گئی، تو نہ جانے کیا سمجھے گی۔ مگر اپنے بچاؤ کی خاطر خطرہ بھی تو مول ہی لینا پڑتا ہے۔

جوتے پٹی تلے چھوڑے اور دبے پاؤں وہ سانس روکے آگے بڑھے۔ جھکی۔ ہ لہنگے کی گوٹ پکڑ کر کھینچ دی۔ دوسرے لمحے انہیں پچھتاوا بھی ہونے لگا۔ شاید غریب کو گرمی لگ رہی ہو، تھوڑی دیر غیر فیصلہ کن انداز میں کھڑے کانپتے رہے۔ پھر دل پر پتھر رکھ کر واپس مڑے۔

ابھی ان کے ٹھٹکتے قدم چوکھٹ تک نہ پہنچے تھے کہ قیامت ٹوٹ پڑی۔ ایک کروٹ

لگا کر لاجو نے انہیں جالیا۔ مرزا کی گگھی بندھ گئی۔ مرزا کے ساتھ زندگی میں ایسی بے جا کبھی نہ ہوئی تھی۔ وہ ہائیں ہائیں کرتے رہے اور لاجو نے ان کی لاج لوٹ لی۔

صبح کو مرزا لاجو سے ایسے شرما رہے تھے۔ جیسے نئی بیاہی دلہن۔ لاجو سینہ زور فاتح کی طرح گنگنا رہی تھی اور پراٹھوں میں گھی کی تہیں جما رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں رات کی بات کا کوئی عکس نہ تھا۔ ویسے ہی روزانہ کی طرح دہلیز پر بیٹھی مکھیاں اڑاتی رہی۔ مرزا ڈر رہے تھے کہ اب وہ انگلی پکڑتے پہنچا پکڑے گی۔

دوپہر کو جب وہ ان کے لیے کھانا لے کے دوکان پر آئی تو اس کی چال میں عجیب سا ٹھمکا تھا۔ لاجو کو دیکھ کر لوگ خواہ مخواہ بھی چیزوں کا بھاؤ پوچھنے آجایا کرتے تھے۔ مارے باندھے کچھ خریدنا بھی پڑ جاتا۔ بغیر کہے لاجو فوراً سامان ناپ تول کر دینے لگتی۔ ہر چیز کے ساتھ ڈھیروں مسکراہٹیں اور نخرے بھی باندھ دیتی۔ اتنی سی دیر میں وہ اتنی بکری کر جاتی کہ مرزا سے صبح سے شام تک نہ ہو پاتی۔ آج انہیں یہ بات بڑی ناگوار گذر رہی تھی۔

مگر اب تو جو مرزا کے سوا راجہ کے نہیں۔ کیا لوٹی چڑھ گئی اور رنگ نکل آیا۔ لوگ وجہ جانتے تھے اور جلے مرتے تھے۔ مرزا کی بھی دن بدن بوکھلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ جتنی وہ ان کی خدمت گزاری کرتی گئی۔ یہ اس کے دیوانے ہوتے گئے ان کے دل میں دنیا کا خوف بڑھتا گیا۔ انہیں لاجو کی بے تکلفیوں کا مدہوش کن تجربہ تھا۔ پرلے درجے

کی بے حیائی تھی، کھانا لاتی تو بازار میں بھونچال آجاتا، کسی کی چٹکی بجتی، کسی کو ٹھینگا دکھاتی۔ تھرکتی، کولہے مٹکاتی، گالیاں جھاڑتی ہوئی آتی تو مرزا کا خون کھول جاتا۔

"تم کھانا لے کر نہ آیا کرو۔"

"کا ہے کو۔۔؟" لاجو کا منہ اتر گیا، سارے دن اکیلی بیٹھی بولا جاتی تھی، بازار میں ذرا رنگ جمتا تھا، ہنسی دل لگی چلتی تھی۔

جب وہ کھانا لے کر نہیں آئی تو مرزا کے دل میں طرح طرح کے شبہے اٹھنے لگے، نہ جانے کیا گل کھیل رہی ہوگی۔ مرزا، وہ وقت بے وقت جاسوسی کرنے آدھمکتے وہ فوراً ان کی تھکن اتارنے پر مصر ہو جاتی۔ ایسی پھنکیت لونڈیا سے خوف نہ آئے گا۔

ایک دن جو یوں ایک دم گھر پہنچے تو دیکھا لاجو ردّی کاغذ والے کو بے نقط سنا رہی ہے اور ردّی والا دانت نکوسے شربت کے سے گھونٹ گٹک رہا ہے۔ مرزا کو دیکھا تو بھاگا، مرزا نے لپک کے گردن ناپی کس کس کے دو جھانپڑ لگائے اور دی ایک لات۔

"کیا قصہ تھا۔؟" مرزا کے نتھنے پھولنے لگے۔

"موت پڑا دس آنے سیر کے دے رہا تھا، میں نے کہا اپنی ماں کو دے جا کے حرام زادے"۔ ردی کا کھلا بھاؤ آٹھ آنے سیر تھا۔

"تم سے کس نے کہا ہے ردّی بیچنے کو۔" مرزا بڑبڑائے اور پیر کھینچ کر تسمے کھولنے لگے۔

مگر اس دن تو ان کے جلال کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے لاجو کو گلی کے لونڈوں کے ساتھ کبڈی کھیلتے دیکھا۔ اس کا لہنگا ہوا میں قلانچیں مار رہا تھا۔ بچے تو کبڈی کھیل رہے تھے؛ بچوں کے باپ لہنگے کی فیاضی سے لطف اندوز ہو رہے تھے، یہ سب ہی باری باری اسے کوٹھا دلانے کی پیش کش کر چکے تھے، جو لاجو نے ٹھکرا دی تھی، مرزا نہایت نخوت سے سر نیوڑھائے گزر گئے۔ لوگ ان پر ہنس رہے تھے۔

میاں جی کا غرا تو دیکھو جیسے وہ ان کی بیاہتا ہی تو ہے۔

لاجو ان کی جان کو روگ کی طرح چمٹ گئی تھی۔ اس کی جدائی کے خیال سے ہی پسینے چھوٹنے لگتے تھے۔ اسٹور میں ان کا بالکل جی نہ لگتا۔ سارے وقت لاجو کا خیال ستاتا۔ نہ جانے کب کسی بھاری پیش کش پہ نامراد کی رال ٹپک پڑے۔

"میاں نکاح کیوں نا پڑھوا لیتے" انہوں نے میرن میاں سے دکھڑا رو یا تو انہوں نے رائے دی۔

"لاحول ولاقوۃ! نکاح جیسی مقدس رسم کو اس قحبہ سے کیسے وابستہ کیا جا سکتا ہے؟ زمانے بھر میں لہنگا اچھال کر اب وہ ان کی دلہن کیسے بن سکتی ہے؟ مگر شام کو جب واپسی پر لاجو غائب ملی تو ان کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ لالہ کم بخت بہت دنوں سے سونگھ رہا تھا۔ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ اس نے پکار کر سب کے سامنے کہا تھا کہ کوٹھا نہیں، وہ کہے تو بنگلہ لے دوں گا۔ میرن میاں بڑے دوست بنتے تھے، لیکن چپکے سے انہوں نے بھی حسبِ حیثیت نذرانہ

پیش کیا تھا۔

مرزا بوکھلائے ہوئے بیٹھے تھے کہ لاجو واپس آگئی۔ وہ راموکی دادی کی پیٹھ ملنے گئی تھی۔ اس دن مرزا نے فیصلہ کر لیا کہ خاندان کی ناک کٹے یا سلامت رہے، لاجو کو نکاح میں لانا پڑے گا۔

"کاہے کو میاں۔؟" جب مرزا نے اپنی تجویز پیش کی تو لاجو بوکھلا گئی۔

"کیوں؟ کیا کہیں اور دیدے لڑانے کا ارادہ ہے۔؟" مرزا بگڑ گئے۔

"تھو۔ کاہے کو لڑاؤں دیدے۔"

"وہ راؤ جی بنگلہ دلانے کو کہتا ہے۔"

"میں تھوکوں بھی نہ اس کے بنگلے پر۔ جوتی ماردی میں نے اس کے تھوبڑے پر۔"

"تو پھر۔؟"

مگر لاجو نہ سمجھ سکی کہ بیاہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو جنم سے ان کی ہے، اور ان کی ہی رہے گی۔ پھر ایسی کون سی خطا ہوئی۔ جو میاں کو نکاح کی ضرورت محسوس ہوئی۔؟ پر ایسا مالک تو نہ جانے کتنے جنم بھوگنے پر ملتا ہے۔ لاجو نے بڑی ٹھوکریں کھائیں تھیں۔ مرزا اسے فرشتے معلوم ہوتے تھے۔ اس کے سب مالک اس کے عاشق بن جاتے تھے، پھر اسے چار چوٹ کی مار دیا کرتے تھے

مرزا نے کبھی اسے پھول کی چھڑی بھی نہ چھوائی اور پیار بھی جی بھر کے کیا، دو جوڑے بنوائے اور سونے کی مندریاں دلائیں، سچے

سونے کا زیور تو اس کی سات پیڑھی تے نہ پہنا ہوگا۔

انہوں نے رامو کی دادی سے کہا، وہ بھی حیرت میں پڑگئی۔

"اے میاں کاہے کو گلے میں گھنٹی باندھو، کیا کسری نخرے کرنے لگی ہے!

تو ماردیو چڑیل کو ٹھیک ہو جائے گی، جہاں بیوتے کاری سے کام چل جائے وہاں نکاح کی کہاں گنجائش ہے۔

مگر مرزا کو تو ایک رٹ لگی تھی، اگر میری ہے تو میرے نکاح میں آجا۔

"کیوں ری کیا تجھے دھرم کی اوٹ لگے ہے۔"

نا میاں ایسی بات نا ہیں تو انہیں اپنا مانتی ہوں، لاجو بڑی میٹھی طبیعت کی تھی، وہ تو دو گھڑی کے گاہک کو بھی دم بھر کے لیے پتی مان کے اس کی سیوا کرتی تھی اس نے کبھی اپنے کسی عاشق کے ساتھ کنجوسی نہیں برتی، دھن نصیب نہ ہوا تن اور من اس نے سینت کے نہ رکھا، جسے دیا جی بھر کے دیا، جی بھر کے لیا، اور مرزا کی تو بات ہی نرالی تھی انہیں دینے اور ان سے چھیننے میں جو مزا آتا تھا وہ کوئی لاجو کے دل سے پوچھتا، ان کے سامنے سب ڈھیٹ کتے معلوم ہوتے تھے وہ اپنی حقیقت جانتی تھی، شادی بیاہ تو کنواریوں کے ہوتے ہیں اور اپنے ہوش میں وہ کبھی کنواری نہ تھی، وہ کسی کی دلہن بننے کے لائق نہیں۔

وہ بہت ہاتھ پاؤں جوڑ کر گڑگڑائی مگر مرزا پر نکاح کا بھوت سوار تھا، نیک ساعت دیکھ کر ایک دن عشاء کی نماز کے بعد نکاح ہو گیا۔ تمام محلے ٹولے میں اودھم

پج گیا۔ لونڈیاں بالیاں ڈھول لے کر سہاگ گانے لگ گئیں۔ کوئی دلہن والی بن گئی۔ کوئی دولہا والی اور مرزا نے ہنس ہنس کے نیگ دیا اور لاجو عرف کنیز فاطمہ مرزا عرفان بیگ کے نکاح میں آ گئی۔

نکاح میں آتے ہی مرزا نے لہنگے پر پابندی لگا دی اور تنگ موری کا پاجامہ کرتا بنوا دیا۔ کنیز فاطمہ کو ٹانگوں کے بیچ میں خلا کی عادت تھی۔ دو الگ الگ پائنچے جس میں دو ٹانگوں کے بیچ میں کپڑا آجائے ذرا جھنجھٹ ہے۔ وہ بار بار اس فضول رکاوٹ کو کھینچے جاتی۔ پہلی فرصت میں اس نے پاجامہ اتار الگنی پر ڈالا اور لہنگا اٹھا کر سر سے پہن ہی رہی تھی کہ مرزا آگئے۔ اس نے لہنگا کمر پر روکنے کی بجائے چھوڑ دیا۔

"لاحول ولا قوۃ" مرزا گرجنے لگے اور چادر کھینچ کر اس پر ڈال دی۔ نہ جانے مرزا نے کیا بھاشن جھاڑا۔ اس کے کچھ پلے نہ پڑا کہ اس نے کیا غلطی کی؟ اس کی اس حرکت پر تو مرزا کی جان جایا کرتی تھی۔ مرزا نے اچھا بھلا لہنگا سچ مچ اٹھا کر چولھے میں جھونک دیا۔

مرزا بھن بھن کرتے چلے گئے۔ وہ چور سی بیٹھی رہ گئی۔ چادر پھینک کر اس نے اپنے جسم کا معائنہ کیا کہ کہیں کوڑھ تو نہیں پھوٹ آیا۔ نل کے نیچے نہاتے وقت وہ بار بار آنسو پونچھتی رہی۔ سرکی والے کا لونڈا مٹھوا پتنگ اڑانے کے بہانے پاس کی چھت پر سے اسے نہاتے دیکھا کرتا تھا۔ آج وہ ایسی اداس تھی کہ نہ اسے انگوٹھا دکھایا نہ اسے جوتی سے دھمکایا، نہ بھاگتی ہوئی کوٹھی پر گئی۔ بلکہ چادر لپیٹ لی۔

دل پر پتھر رکھ کر اس نے شیطان کی آنت جیسی موریاں چڑھائیں۔ مرے پر سو درے اوپر سے کمر بند سنک گیا۔ چلا چلا کر گلا پڑ گیا۔ تب جو آئی اور کمر بند پڑا۔ یہ بندوق کا غلاف کس بد مذاق

نے ایجاد کیا ہوگا، جتنی بار سی جاؤ ڈھولو باندھوا

جب مرزا دکان سے لوٹے تو پھر کمر بند سٹک گیا تھا۔ وہ انگلی سے پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی، مرزا کو اس پر پیار آ گیا، چمکار کر گود میں سمیٹ لیا، بڑی تگ و دو سے کمر بند ہاتھ آیا، تب اسے پاجامے سے اتنی شکایت نہ رہی۔

پھر ایک مصیبت اور کھڑی ہو گئی۔ پہلے جو لاجو کی رعنائیاں تھیں۔ وہ مرزا کی دلہن میں بے حیائیاں بن گئیں۔ یہ بازاری عورتوں کے لٹکے شریف زادیوں پر زیب نہیں دیتے۔ وہ ان کے خوابوں کی روایتی دلہن نہ بن پائی کہ مرزا پیار کی بھیک مانگیں، یہ شرمائے وہ ضد کریں یہ بگڑ جائے گی۔ وہ منائیں یہ روٹھ جائے۔ لاجو تو سڑک کا پتھر تھی، سیجوں کا پھول بننے کے گر نہیں جانتی تھی۔ ڈانٹ ڈانٹ کر مرزا نے لگامیں لگائیں۔ آخر کار بندریا کو سدھا رہی لیا۔

مرزا اب نہایت مطمئن تھے کہ انہوں نے لاجو کو شریف زادی بنا کر ہی چھوڑا۔ یہ اور بات ہے کہ اب انہیں گھر بھاگنے کی زیادہ جلدی نہیں ہوتی۔ عام شوہروں کی طرح یار دوستوں میں بھی اٹھ بیٹھ لیتے کہ لوگ جورو کا غلام نہ کہیں، معشوق کے ناز اٹھانا اور بات ہے، مگر بیوی کی جوتیاں مرد برداشت نہیں کر سکتا۔

اپنی غیر حاضریوں کی تلافی کرنے کے لیے انہوں نے ایک ماما رکھنے کی تجویز پیش کی مگر لاجو کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ جانتی تھی کہ میاں کنجری کے ہاں جانے لگے ہیں، سارے محلے کے میاں لوگ جاتے تھے مگر گھر میں وہ کسی کا عمل دخل برداشت نہیں کر سکتی۔ کوئی اس کے جھمجھماتے برتنوں کو ہاتھ لگائے، اس کی رسوئی میں قدم رکھے تو

اس کی ٹانگیں چیر کر پھینک دے گی۔ وہ مرزا میں سا جھا برداشت کرسکتی تھی مگر گھر کی وہی اکیلی مالکن تھی۔

پھر مرزا جی جیسے لاجو کو گھر میں رکھ کے بھول گئے۔ ہفتوں ہوں ہاں سے آگے بات نہ ہوتی۔ جب تک وہ داشتہ تھی سب آنکھیں سینکتے تھے۔ جب کسی شریف کے گھر بیٹھ گئی تو محلے ٹولے کے اصولوں کے تحت ماں، بہن اور بیٹی ہو گئی۔ کوئی بھول کر بھی ٹاٹ کے پردے کے پیچھے نگاہ ڈالنے کی زحمت نہ کرتا سوا مِٹھوا سیر کی والے کے لونڈے کے۔ وہ اب بھی وفا نبھا رہا تھا، وہ اب بھی کوٹھے پر پتنگ اڑاتا۔ جب مرزا چلے گئے اور لاجو کام کاج سے فارغ ہو کر نل کے نیچے نہانے بیٹھتی، پردے کے خیال سے ہی تو نل لگوایا تھا۔ لاجو نے کوٹھے کی طرف دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ مگر اس رات مرزا یار دوستوں کے ساتھ دسہرے کے جشن منانے غائب رہے تھے۔ صبح جھینپے ہوئے لوٹے اور جلدی جلدی نہا دھو کر اسٹور چلے گئے۔ لاجو ترڑی بیٹھی تھی۔ تب ہی اس کی نظر کوٹھے کی طرف اٹھ گئی۔ یا شاید اس دن مٹھوا کی نظروں میں بھالے لگے ہوتے تھے، جو اس کے گیلے جسم میں پیوست ہو گئے اور لونڈے کی بہت دن بعد اس دن پتنگ کٹ گئی۔ ڈور ٹوٹی تو لاجو کی بیٹھ پر گھسّا مارتی چلی گئی۔ لاجو نے سسکاری بھری اور قصداً یا سہواً چادر لئے بغیر اٹھ کر کوٹھری میں لپ گئی۔ ایک بجلی سی کوندی اور سامنے کی کوٹھی پر گری۔ پھر اسے خیال آیا کہ نل تو کھلا ہی چھوڑ آئی تھی۔ لہٰذا واپس الٹے پاؤں بھاگی۔

اس کے بعد جب کبھی لاجو حلوائی کے یہاں سے کچھ منگوانے کو ٹاٹ کا پردہ سرکاتی تو مِٹھوا آس پاس ہی منڈلاتا نظر آتا۔

"اے مٹھوے، کیا دن بھر گوبر کا سا چوتھ بنا بیٹھا رہوے ہے۔ جا ذرا دو کچریاں تو لادے، چٹنی میں خوب ساری مرچیں ڈلوائیو۔"

پھر مٹھوا اور بھی ہل گیا، اگر غلطی سے نہلاتے وقت کوٹھے پر نہ نظر آتا تو پھڑ پھڑا کے جاگ اٹھتا۔ جو پیار وہ ساری عمر دونوں دونوں ہاتھوں سے لٹاتی آئی تھی مٹھوا کے لیے بھی حاضر تھا۔ مرزا اگر کسی وقت کا کھانا نہ کھاتے تو وہ پھینک تھوڑا ہی دیتی، کسی غریب، حاجتمند کو کھلا دیتی تھی اور مٹھوا سے زیادہ اس کی عنایات کا کون حاجت مند تھا۔

مرزا نے لاجو کے پیر میں بیاہ کی زنجیریں ڈال کے سوچ لیا کہ اب ہو گئی وہ گرہستن اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتے تو یقین بھی نہ کرتے۔ لاجو نے جو انہیں یوں بے وقت چوکھٹ پر کھڑے دیکھا، تو بے اختیار ہنسی نکل گئی۔ اس نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ مرزا اس شدت سے برا مانیں گے، مگر مٹھوا تاڑ گیا اور دھوتی اٹھا کے ایسا بھاگا کہ تین گاؤں پار کر کے ہی دم لیا۔

مرزا نے لاجو کو اتنا مارا کہ اگر وہ دنیا کے سرد و گرم نہ جھیلے ہوتی تو وہ اللہ کو پیاری ہو جاتی۔ اسی وقت یہ خبر سارے گاؤں میں آگ کی طرح پھیل گئی کہ مرزا نے اپنی گھر والی کو مٹھوا کے ساتھ پکڑ لیا اور دونوں کو جہنم واصل کر دیا۔ مرزا کا منہ کالا ہو گیا۔ خاندان کی ناک کٹ گئی۔ لوگ جوق در جوق تماشا دیکھنے جمع ہوئے، مگر یہ دیکھ کر انہیں سخت ناامیدی ہوئی کہ مٹھوا تڑی ہو گیا، اور گھر والی لوٹ پھوٹ گئی، مگر جی جائے گی۔ رامو کی دادی اسے سمیٹ لے گی۔

کوئی سوچے گا کہ اتنے جوتے کھانے کے بعد لاجو کو مرزا کی صورت سے نفرت ہو گئی ہو گی۔ توبہ کیجیے، جو ناکاری سے تو اصل بندھن بندھا جو نکاح سے بھی نہ بندھا تھا۔ ہوش میں آتے ہی مرزا کی خیریت پوچھنے لگی۔ اس کے سب ہی آقا دیر سویرا سکے عاشق بن بیٹھے تھے۔ اس عنایت کے بعد تنخواہ کا سوال ختم ہو جاتا۔ مفت کی رگڑائی، اوپر سے چاد چوٹ کی مار۔ مرزا نے آج تک اسے پھول کی چھڑی، نہ چھوائی تھی۔ دوسرے آقا اسے یار دوستوں کو مستعار دے دیتے تھے، مرزا نے آج تک اسے اپنی چیز سمجھا، اس پر اپنا حق جانا۔ یہ اس کی عزت افزائی تھی، حالانکہ استعمال میں نہ تھی پھر بھی انہیں اتنی پیاری تھی۔ درد پر مرزا کی ٹمیسیں غالب آگئیں۔ سب نے اسے سمجھایا کہ جان کی امان چاہتی ہے تو بھاگ جا، مگر وہ نہ مانی۔

میرن میاں مرزاجی کو روکے ہوئے تھے۔ بغیر ناک چوٹی کاٹ کے قتل کئے کوئی چارہ نہ تھا۔ ان کی ناک کٹ گئی۔ لاجو زندہ بچ گئی۔ اب وہ دنیا کو کیسے منہ دکھائیں گے۔

"اماں، ایک مال زادی کی خاطر پھانسی پر چڑھ جاؤ گے۔"

"پرواہ نہیں۔"

"میاں طلاق دے دو سالی کو، اور چھٹی۔" میرن میاں نے سمجھایا۔ کوئی شریف زادی ہوتی تو اور بات تھی۔

مرزا نے اسیوقت طلاق دی۔ مبلغ ۳۲ روپے مہر اور اس کے کپڑے لتے رامو کی دادی کے ہاں بھجوا دیا۔

لاجو کو جو طلاق کی خبر پہنچی تو جان میں جان آگئی۔ جیسے سر سے بوجھ اتر گیا۔ نکاح اسے راس

نہیں آیا۔ یہ سب اسی مارے ہوا۔ چلو پاپ کٹا۔

"میاں تو ناراض نہیں ؟" اس نے رامو کی دادی سے پوچھا۔

"تیری صورت نا دیکھنا چاویں، کہیں کر یاں سے منہ کالا کر جا۔"

مرزا کی طلاق کی خبر سارے محلے میں سرپٹ دوڑ گئی۔ فوراً لالہ نے پیغام بھجوایا۔ "بنگلہ تیار ہے۔"

اس میں اپنی اماں کو بٹھا دے۔" لاجو نے کہلوا دیا۔ مبلغ ۳۲ روپے میں سے دس اس نے لورڈا ور لاجنگ کے رامو کی دادی کو دیئے۔ تنگ پاجامے شکورا کی بہو کے ہاتھ اونے پونے بیچ لیے۔ پندرہ دن میں لوٹ پیٹ کے کھڑی ہو گئی۔ کمبخت کی جیسے دھول جھڑ گئی۔ جوتے کھا کر اور نکھر آئی۔ کمر میں سو سو بل پڑنے لگے۔ پان کا بیڑا لینے یا سلیو کچوری لینے حلوائی کی دکان تک نکل جاتی تو گلی کی چہل پہل بڑھ جاتی۔

مرزا کے دل پر آرے چلتے۔ ایک دن نواڑی سے کھڑی الاچی کے دانوں پر جھگڑ رہی تھی۔ وہ مزے لے رہا تھا۔ مرزا کٹے کٹے نظر بچا کے نکل گئے۔

"اماں تمہیں تو ہو گیا ہے خبط۔ اب تمہاری بلا سے وہ کچھ کرتی پھرے۔ تم نے طلاق دے دی۔ تمہارا اب اس سے کیا رشتہ ہے؟"

"وہ میری بیوی تھی میں کیسے برداشت کر سکتا ہوں؟" مرزا بگڑے۔

"تو کیا ہوا اب تو نہیں بیوی۔ اور سچ پوچھو تو وہ تمہاری تھی ہی نہیں۔"

"اور نکاح جو ہوا تھا۔؟"

"قطعی ناجائز۔"

"یعنی کہ ....."

"ہوا ہی نہیں برادر، نہ جانے وہ کس کی ناجائز اولاد ہو گی۔ ناجائز سے نکاح حرام۔"

میرن میاں نے فتوی جڑا۔

"تو نکاح ہوا ہی نہیں ۔؟"

"قطعی نہیں۔" بعد میں ملا جی نے بھی صاد کر دیا کہ حرامی اولاد سے نکاح جائز نہیں۔"

"تو گویا ہماری ناک بھی نہیں کٹی۔" مرزا کے سر سے بوجھ ہٹ گیا۔

"بالکل نہیں۔"

"بھئی کمال ہے تو پھر طلاق بھی نہیں ہوئی ۔؟"

"بھائی میرے نکاح ہی نہیں ہوا تو طلاق کیسے ہو سکتی ہے۔"

"مبلغ بتیس روپے مہر کے مفت ہی میں گئے۔" مرزا کو تاسف ہونے لگا۔

فوراً یہ خبر سارے محلے میں چھلانگیں مارنے لگی کہ مرزا کا ان کی گھر والی سے نکاح ہی نہیں ہوا، نہ طلاق ہوئی۔ مبلغ بتیس روپے بیشک ڈوب گئے۔

لاجو نے یہ خوش خبری سنی تو ناچ اٹھی سینے پر سے بوجھ پھسل گیا۔ نکاح اور طلاق ایک ڈراؤنا خواب تھا، جو ختم ہو گیا تو جان چھوٹی۔

سب سے زیادہ خوشی تو اس بات کی تھی کہ میاں کی ناک نہیں کٹی۔ اسے میاں کی عزت جانے کا بڑا دکھ تھا۔ حرامی ہونا کیسا وقت پر کام آیا۔ خدانخواستہ اس وقت وہ کسی کی جائز اولاد ہوتی تو چھٹی ہو جاتی۔ رامو کی دادی کے گھر میں اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ زندگی میں کبھی یوں گھر کی مالکن بن کے بیٹھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اسے گھر

کی فکر لگی ہوئی تھی چوری چکاری کے ڈر سے میاں نے اتنے دن سے جھاڑو بھی نہیں دلوائی تھی۔ کوڑے کے انبار لگ رہے ہوں گے۔ وہ اسٹور جا رہے تھے، لاجو نے راستہ روک لیا۔

"پھر میاں کل سے کام پر آجاؤں۔" وہ اٹھلائی۔

"لاحول ولا قوۃ۔" مرزا سر نیوڑھائے لمبے لمبے ڈگ مارتے نکل گئے۔ دل میں سوچا کوئی ماما رکھنی ہی ہوگی، یہ بدذات ہی سہی۔ بات صاف ہو ہی گئی۔

لاجو نے کل وَل کا انتظار نہیں کیا۔ چھتوں چھتوں گھر میں کود گئی۔ لہنگے کا لنگوٹ کیا اور جٹ گئی۔

شام کو مرزا لوٹے تو ایسا لگا مرحومہ بی اماں آگئی ہوں۔ گھر صاف چندن۔ لوبان کی بھینی بھینی خوشبو کورے مٹکے پر جھلملاتا منجھا ہوا کٹورا جی بھر آیا۔ چپ چاپ بھنا ہوا سالن اور روغنی روٹی کھاتے رہے۔ لاجو اپنی حیثیت کے مطابق دہلیز پر بیٹھی پنکھا کرتی رہی۔

رات کو دو ٹاٹ کے پردے ملا کر جب باورچی خانے میں لوٹی تو مرزا پر پھر شدت کی پیاس کا دورہ پڑا۔ جی مارے لیٹے اس کے کڑوں کی جھنکار سنتے رہے، کروٹیں بدلتے رہے۔ جی مڑ رہا تھا کہ بڑی بے قدری کی تھی انہوں نے اس کی۔

"لاحول ولا قوۃ ——" یکایک وہ بھنائے ہوئے اٹھے اور ٹاٹ پھاڑ کے گھر والی کو سمیٹ لیا۔ منزلی

ہماری زیرِ طبع مطبوعات

دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر اخبار "ریاست" کے اداریوں، کالموں اور خطوط کا مجموعہ

قلمزار

ہندوستان کے مشہور ڈرامہ نگار بلونت گارگی کی سوانح عمری

ننگی دھوپ

ہندوستان کی افسانہ نویس اجیت کور کی سوانح عمری

خانہ بدوش

ہندوستان کی مشہور افسانہ نگار اور ناول نگار دلیپ کور ٹوانہ کی سوانح عمری

ننگے پاؤں کا سفر

سنہ ۱۹۴۷ء کے واقعات پر مبنی رامانند ساگر کی عظیم کتاب

اور انسان مر گیا

مکتبہ شعر و ادب ○ سمن آباد ○ لاہور ۱۵